

اولڈ بوائے



مظہر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲-۴-۴ سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا
قیمت ششماہی

ROCKLANDS, SAIFABAD,
Hyderabad Deccan.
9th NOVEMBER 1925.

My Dear AHMED,

I am giving this letter of introduction to Moulvi Manzar Ali a well-known man and a great scholar and author of books. Two of his books were patronised by His Exalted Highness and were published at Government expense. He will show them to you. He has now written a book which contains a short account of each and all of the State Officials and others. I think our Exalted Master is sure to like and favour with his patronage.

I am sure you will like Manzar Ali when you have a talk with him and see some of the work he has done.

Yours ever affectionately,
SYED HOOSAIN BILGRAMI.

NAWAB SIR AHMED HOOSAIN KHAN,
AMIN JUNG BAHADUR, K.C.I.E., C.S.I., etc.



ربندر ناتھ ٹگور جو زمانہ حال کا ایک نامی گرامی شاعر ہے دنیا کی ممتاز ہستیوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کی طباعی مختلف الجہت ہے۔ انگلستان کے عظیم الشان شاعر کی طرح ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند کو بھی ہمہ گیر کہنا بالکل بجا ہوگا۔ ایک مُغنّی اور ڈراما نویس، فسانہ نگار اور دبیر، ترنم ریز نثار اور نقاش کی حیثیت سے جو اضافہ ٹگور نے انگریزی ادب میں کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ قدرت نے اس کے کلام میں خاص دلاویز شیرینی اور نغمہ سرائی عطا کی ہے۔ وہ بحرِ فطرت کا غواص ہے اور جو ربط و یکجہتی انسان اور فطرت میں پیدا کر دیتا ہے وہ بے نظیر ہے۔ اس کا طرزِ تحریر اس زبان میں جو اسکی مادری زبان نہیں ہے، انگریزی زبان کے اساتذہ کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے۔ ٹگور کے یہاں مُہمل تخیل نہیں پایا جاتا۔ وہ زمانہ حال کے شعراء میں سر برآوردہ ہے۔ اُنیسویں صدی کی اعلیٰ ترین شخصیت جو سرزمین انگلستان میں نمایاں ہوئی، یعنی طامس کارلائل، کے نزدیک شاعری صرف تخیلات کا انعکاس ہی نہیں بلکہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ ماضی یا حال جس زمانہ کی نسبت لکھ رہا ہو اسوقت کے تاثرات اور رجحانات کا پورا چربہ اُتار دے۔ اسکے نزدیک ادب رازِ سربستہ کے افشاء کی کلید ہے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسان کا جامہ ہستی ناظر کے لئے عُریان ہو جاتا ہے۔ شادی کا خاتمہ مسرت پر اور موت کا انجام غم و اندوہ پر ہوتا ہے۔ لیکن ہم آنکھیں رکھتے ہیں اور دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں پر سنتے نہیں۔ یہ صرف شاعر ہی کا حصہ ہے کہ وہ ان کو پرکھے، دلاویز اور لطیف بنائے اور پھر اس مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث کر کے ہمارے لئے باعث فلاح و بہبود بنائے۔ ٹگور کی شاعری میں ہر بات میں الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ انسان کے روبرو ایک اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے اور موجودہ

زمانہ کے رُخ کا روشناس ہے۔ معاشرتی اور سیاسی مسائل جو زمانہ حال کے بڑے بڑے دوراندیشوں کو الجھنوں میں ڈالے ہوئے ہیں، ٹگور بھی ان میں منہمک ہے اور وہ جس ملک میں جاتا ہے وہاں کی قوم کو ہدایت کرتا ہے جسطرح ایک چڑیا اپنے آشیانہ سے نکلکر مختلف درختوں کی ٹہنیوں پر اپنے سُریلے نغمے گاتی پھرتی ہے اسی طرح ہندوستان کی بلبل ہزار داستان، انگلستان سے امریکہ اور امریکہ سے جاپان جاتی ہے اور وہاں اخوت کا سریلا راگ گاتی ہے اور پھر جذبۂ وطن کی کشش اسے اسیطرح واپس لے آتی ہے جسطرح چھوٹی چڑیا دن بھر مصروف پرواز رہنے کے بعد شام کو اپنے ہی گھونسلے میں بسیرا کرتی ہے۔

ٹگور ایک جگہ لکھتا ہے۔

مقصود ہے میری زندگی کا حرکات سے اپنے تیرا اظہار

ہر دیکھنے والے پر عیاں ہے افعال سے میرے تیری تصویر

شاعر کے الفاظ کا سمجھنے والا خواہ کچھ ہی مطلب کیوں نہ سمجھے لیکن اس کا حقیقی اور انتہائی مقصود تیری ہی ذات سے متعلق ہے"۔

ٹگور روحانیت کا پیغامبر اور انسانیت کا مغنی ہے۔ جس اعلیٰ مقصد کو اس نے پیش نظر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ جن الفاظ میں ٹگور نے اپنے ایک ہیرو کے مقصد کا اظہار کیا ہے وہی الفاظ خود اسپر صادق آتے ہیں۔ وہ ایک شاہی پیغامبر ہے جو کوبکو دربدر اس کا پیغام پہونچاتا پھرتا ہے۔

ٹگور کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا مطربانہ رنگ ہے۔ گیتان جلی جو شاعر کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے اس خصوصیت کی بناء پر اعلیٰ ترین قدردانی کی مستحق ہوئی۔ اس مجموعہ پر اسے نوبل انعام سے مشرف کیا گیا۔ گیتان جلی مطربانہ نظموں کا مجموعہ ہے، اور اپنے اس رنگ میں بڑے حسن و جمال سے نکھری ہوئی ہے۔ اس میں شاعر کے دلی جذبات کی پوری کیفیت موجود ہے۔ انسانی روح کی اُس "ہستی عظیم" کے ساتھ وابستگی کی تمنا کا حسین پیرائے اور بلند آہنگی سے اظہار کیا گیا ہے" میں صرف جذبۂ الفت کا منتظر ہوں تاکہ اپنی ہستی اسپر مٹادوں" شاعری کی تشنگی قرب کا پتہ اس کی ایک دعا سے چلتا ہے۔

تیرے دلکی صدا لگاتار یہی ہو کہ میں تجھے اور صرف تجھے ہی چاہتا
ہوں۔ باقی تمام خواہشات جو مجھے بھٹکائیں، غیر حقیقی اور لایعنی ہیں"۔

اس کا یہ ذوق یکجہتی اسقدر زبردست ہے کہ وہ التجا کرتا ہے۔

"میری ہستی صرف اتنی رہجائے کہ میں تجھے "اپنا سب کچھ" کہہ کر
پکار سکوں۔

میری ہستی صرف اتنی رہ جائے کہ میں تجھی کو اپنے گرد پا سکوں
ہر راہ سے تجھی تک پہونچوں، اور ہر دم اپنی محبت تیرے لئے پیش کروں"۔

وہ خالق کو مالک، والدین اور رفیق سمجھتا ہے۔ کیف نغمہ سے مخمور ہوکر وہ اپنے مالک کو رفیق کے نام سے پکارتا ہے۔ اسکے نزدیک ہستی عظیم بادشاہوں کی بادشاہ بھی ہے اور پتا بھی جس کے قدموں پر وہ سربسجود ہے۔ کہیں وہ اسے بھائی نظر آتا ہے جسے وہ اپنے سرائے میں بمسرت حصہ دار بناتا ہے۔ کہیں وہ اسے اپنی "مادر شفیق" کی حیثیت سے دیکھتا ہے، جس کے لئے وہ اپنے دُر اشک کی مالا پروتا ہے۔ پروردگار کے ایسے تخیل سے ایک سچے پرستار کے تصورات کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خالق کے کن کن اوصاف کا وقت واحد میں شیدائی ہوتا ہے۔ مناظر فطرت میں اسے ایک بادشاہ کا تزک و احتشام نظر آتا ہے۔ جب پرستار پر خدا کی رحمت و شفقت ہوتی ہے تو اسے "مادر شفیق" کے بھیس میں نظر آتا ہے جو مسکراتی ہوئی دست شفقت دراز کرتی ہے۔

ان نغموں میں دل کی تڑپ اور انتظار کی بیقراری کو خوب واضح کیا گیا ہے۔ روح اسطرح کُل میں سما جانے کے لئے بیقرار ہے جیسے ایک دوشیزہ چند لمحے اپنے دلبر کے سینے سے لگ کر اپنے آپ کو بھولجانے کی متمنی ہو۔ یہ صریح بے مہری ہو اگر اس کا دلبر ایسی حالت میں بھی کہ وہ مصوّسیت اور شوق کے جذبہ سے اسکی منتظر ہو اس کے پاس آئے۔ پھر اگر انتظار کرتے کرتے وہ بددل اور مغموم ہو جائے تو تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ شاعر اپنے تئیں اس بے نوا دوشیزہ سے تعبیر کرتا ہے جو پھولوں سے گود بھرتی ہے اور احاطل انتظار میں آنسو بہاتی ہے۔ ایک اور جگہ وہ کہتا ہے۔

"تجھ سے ملنے کی موہوم اُمید پر میری زندگی کے دن گذرتے ہیں۔
لیکن اب تک اُمید پوری نہ ہوئی تو بے دردی سے مجھ سے روپوشں ہے۔
رات ختم ہونے کو ہے تو ابھی تک نظروں سے اوجھل ہے۔

افسردگی کی حالت میں وہ جو التجا کرتا ہے، نہایت دردانگیز ہے۔

"اگر تو مجھے اپنی صورت نہیں دکھائے گا، اگر تو مجھے یوں ہی اکیلا
چھوڑ دیگا معلوم نہیں یہ برکھا رت کیسے کٹے گی"

اے میرے یکتا دوست۔ میرے بہترین محبوب میرے گھر کے
دروازے کھلے ہیں۔ خواب کی طرح نہ گذر جانا۔

"آج میری نیند اُڑ گئی۔ اے محبوب! میں گھڑی گھڑی دروازہ
کھولتی ہوں اور اندھیری رات میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی ہوں"۔

وہ اس انتظار سے اُکتا کر کہتا ہے۔

"دن گذرے جاتے ہیں اور تو دکھائی نہیں دیتا۔ میرے دل کے
مالک! اب زیادہ منتظر نہ رکھ"۔

ہندوستان کے اس فلسفی شاعر کے نزدیک حیات غیر متناہی ہے۔ گیتانجلی کے ابتدائی نغمہ ہی میں اس فلسفہ کی کلید موجود ہے۔

"تو نے مجھے غیر متناہی بنا دیا۔ تیری یہی مرضی ہے اس نازک ساغر کو
تو بار بار خالی کرتا ہے اور ہمیشہ اک زندگی تازہ سے اسے معمور کردیتا ہے"۔

اس خیال سے کہ انسان کی زندگی کا انجام موت نہیں ہے بلکہ روح اپنا قالب وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے اہل مشرق بخوبی واقف ہیں۔ شاعری میں عموماً مسئلہ حیات پر بحث ہوتی ہے لیکن مسئلہ مات یعنی انسان پر ایسی دنیوی زندگی کے بعد کیا گذرتی ہے، اس پر بہت کم التفات کیا جاتا ہے۔ عوام کے نزدیک موت وحشتناک اور راز سربستہ ہے بلکہ ان لوگوں میں بھی جن میں فلسفیانہ رنگ موجود ہے۔

موت کا ڈر پایا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری میں مسئلہ زندگی یعنی انسانی کوششوں اور ناکامیوں کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے اس تاریک اقلیم کا خیر مقدم توکجا اسکی کیفیات و حالات کو بھی قلمبند کیا ہو۔ ملٹن کہتا ہے ۔

"موت جو کچھ بھی ہو، زندگی اور موت دونوں پہلو بہ پہلو ہیں۔

...... موت یقیناً کوئی وحشتناک چیز ہے"۔

انگلستان کے عظیم ترین شاعر کے نزدیک جس کی نظر رسا افق سماوی سے عمق ارضی تک تھی، موت ایک ایسا خطہ ہے جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آیا۔ وہ اپنے ایک مقبول ڈرامے میں اپنے ہیرو کو جو اس کا ہم خیال ہے اس سوچ بچار میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ جب کسی کام کا انجام کار موت کے باعث غیر متیقین ہو تو ایسی صورت میں آیا زندگی قابل التفات ہے یا نہیں آخرکار مشغولیت کی زندگی کے بعد وہ آنکھیں بند کرلیتا ہے اور سکوت کا پردہ پڑجاتا ہے۔ لیکن ہندی شاعر کے یہاں جو خیر مقدم موت کا کیا جاتا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اسکے نزدیک موت زندگی کی آخری تمنا کا پورا ہونا ہے۔ زندگی اور موت توام ہیں۔ اسکے نزدیک موت بھی زندگی کی طرح حقیقی چیز ہے اور انسان دونوں اقلیم سے مانوس ہوتا ہے۔ کیونکہ بچہ اسیوقت روتا ہے جب ماں اسے ایک چھاتی سے چھڑاتی ہے۔ لیکن جوں ہی دوسری چھاتی سے لگا لیتی ہے اسے تسکین ہوجاتی ہے۔ جب روح قبض ہوجاتی ہے تو کچھ تشویش ضرور ہوتی ہے لیکن فوراً ہی دوسرے اقلیم سے مانوس ہوکر مسرور ہوجاتی ہے۔ دنیا میں انسان کی ترقی کے متعلق شاعر کا خیال ہے کہ اس کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر زیادہ وہ دنیوی ہوتا جاتا ہے۔ اسے ٹھیک یاد نہیں کہ کب اس نے آستانۂ عالم پر قدم رکھا تھا۔ لیکن وہ ایک بات محسوس کرتا ہے جسقدر عمر بڑھتی ہے اسی قدر وہ اپنے آپ کو اصلیت سے دور پاتا ہے۔

"وہ جسے میں اپنے نام سے محصور کئے ہوئے ہوں قفس میں

پھڑپھڑا رہا ہے۔ میں چاروں طرف سے دیواریں بنانے میں مصروف ہوں۔

یہ دیواریں آسماں کی طرف بلند ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی میں اپنے وجود حقیقی کو

اس کے تاریک سایہ میں گم پاتا ہوں۔"

یہ خیال ورڈسورتھ کے اس خیال سے کسقدر مشابہ ہے۔

"لڑکے کی درازی عمر کے ساتھ قفس عنصری کا سایہ بھی

بڑھتا جاتا ہے۔"

یہاں تک کہ آخر کار۔

"اس شان و شکوہ کو فراموش کردیتا ہے اور اس قصر شہنشاہی

کو بھولجاتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔"

ربندرناتھ کے نزدیک جسقدر زیادہ ہم دنیا میں رہتے ہیں اسیقدر زیادہ علائق دنیوی میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ طویل زمانہ تک مبتلائے حرص و ہوس رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد انسان خود اپنے ہی بیت المال میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اس پر ایک مشہور فلسفی کا مقولہ یاد آیا۔ وہ کہتا ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔"

گیتان جلی مذہبی شاعری کی ایک پرشوکت مثال ہے۔ اس میں کوئی خاص مذہبیت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک عام مذہب ہے جو "انسانیت کا مذہب" ہے۔ حقیقی مذہب میں تین جزو ہوتے ہیں۔ صفائی قلب، ہمدردی بنی نوع، اور خدا کا اعتقاد۔ ایک سچے بھگت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل صاف رہے۔ اسکی سوا یہ ہوتی ہے کہ اسے ایسی قدرت عطا ہو کہ اس کے کلام، خیال، اور عمل میں پاکیزگی ہو۔ سچا مذہبی آدمی بنی نوع کا عاشق ہوتا ہے۔ اس کی فراخ دلی امیر و غریب، حسین و کریہ سب پر حاوی ہوتی ہے وہ اس عظیم الشان طاقت کا معترف ہوتا ہے جسکے دست قدرت میں مخلوق کی قسمت ہے۔ اس کا علم کہیں عاجز نہیں ہے اور اسکی گرفت نظر سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنی زندگی اس روح کی نظر کردیتا ہے اور ہر وقت اس امر کا خواہاں رہتا ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو وہ (روح اعظم) اسے اپنے آغوش میں لے لے۔

"مجھ پر بار احسان بہت زیادہ ہے۔ میری ناکامیاں کثیر اور میری

شرمساری سخت اور مخفی"۔

لیکن اس کی التجا یہ ہے کہ معبود اپنے فضل سے

"مفلسی کو دل سے بیخ و بن سے دور کر دے، مجھے طاقت دے کہ

میں غریبوں سے کبھی غافل نہ رہوں اور نہ مغروروں کے آگے سر جھکاؤں"۔

وہ دنیا سے الگ رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ عموماً ہندو فلسفی یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں رہنے سے تن من کثیف ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ گوشۂ تنہائی کو دنیا والوں کی ہنگامہ زا اور پر فساد زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ نکتۂ خیال ہندوستان کے اس ممتاز شاعر کے نزدیک قابل استحسان نہیں۔ اس کے نزدیک انسانیت کا مطالعہ سرچشمۂ مسرت ہے اور وہ اس میں اس عظیم الشان طاقت کے جلوے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے کہ وہ دنیا کی "عظیم الشان مجلس" میں موجود ہے۔ اس بھگت کی مثال جو دنیا سے اسلئے الگ تھلگ رہتا ہے کہ اس کی آلائشوں میں نہ گرفتار ہو جائے بعینہٖ اس بچہ کی سی ہے جو شاہانہ ملبوس کی وجہ سے کھیل کود سے قاصر ہے۔

وہ کہتا ہے۔

"اے شفیق ماں! اس شاہانہ ملبوس سے کیا فائدہ، اگر اس کی

وجہ سے (انسان) زمین کی پرصحت خاک سے دور رہنے پر مجبور ہو۔ اور

حیات انسانی کی تماشاگاہ عام میں شریک ہونے سے باز رہے"۔

اس کے نزدیک معبود حقیقی عاجز، غریبوں اور بے کسوں کے ساتھ ہے۔

"وہ عاجز غریبوں اور بے کسوں کے جامہ میں پھرتا ہے"۔

"وہ عاجز مسکینوں اور بے سہارا یتیموں کے ساتھ رہتا ہے"۔

افضل حسین فاروقی

انکشاف!

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپکا کارڈ مورخہ ندارد۔ مجھے کافی عرصہ کے بعد کل ملا۔ آپ نے اس کو جونپور کے پتہ سے روانہ کیا اور مجھے اس میں لطف آیا کہ اس کو اچھا خاصہ طواف کرنا پڑا۔ میں جونپور سے دسمبر ۲۶ء میں مراد آباد ٹریننگ میں بھیجا گیا اور اس کو ختم کرکے مارچ ۲۷ء میں باندہ (بندیلکھنڈ) میں تعینات ہوا، جہاں ابتک موجود ہوں۔ آپ دسمبر ۲۷ء میں دسمبر ۲۶ء کا پتہ تحریر فرماتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کارڈ جونپور، اور مراد آباد میری تلاش کرتا ہوا باندہ پہنچتا ہے اور اس کو بھی وہ تمام سفر طے کرنا پڑتا ہے جو مجھ کو جونپور سے باندہ آنے میں کرنا پڑا۔

آج سے تقریباً دو سال پیشتر کئی احباب کے خطوط تقاضہ سے لبریز میرے پاس اس غرض سے پہنچے تھے کہ میں اولڈ بوائے کو مضمون دوں جو بھوپال سے نکلتا ہے اب جو اولڈ بوائے آپ بھیجے رہے ہیں، یہ دکن سے سر نکالتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرحوم اولڈ بوائے کا نیا جنم کون سا ہے، وہ جو بھوپال میں لیا گیا، یا، یہ جو حیدرآباد میں لیا جاتا ہے؟ نہایت ضروری تھا کہ آپ اس ابہام کی تشریح پہلے ہی رسالہ میں کرتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عمداً پہلو تہی کی گئی ہے۔ پھر کیا سمجھا جاوے؟

مضمون لکھنے کا مرض ایک کہنہ و ناقابل علاج مرض بن چکا ہے اور یقین تھا کہ اس سے شفا میسّر نہ آسکیگی، مگر ڈپٹی کلکٹری کی ترقی نے بتا دیا کہ "ہر فرعونے راموسے" بالکل صحیح ہے۔ حالت یہ ہے کہ مہلت دم زدن میسر نہیں آتی لہذا وقت میسر آنے پر لامحالہ مضمون نگاری کا ازالہ ہو جائے گا۔ اب بتائیے اس

"تنگ آمد بجنگ آمد" کا کیا چارہ کار ہوسکتا ہے؟ ——— میری نگاہ میں تحصیلداری ایک چیز تھی اور ڈپٹی کلکٹری محض دماغ سوزی کا نام ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں دو تجربے ایسے ہوئے ہیں جو میرا جی چاہتا ہے کہ تمام نوجوان دنیا کی آگاہی کے لئے مشتہر کردوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ اس کا نتیجہ کبھی ہرگز نہیں ہوگا۔

ان تجربات میں پہلا یہ ہے کہ ہر نوجوان اگر خدا توفیق دے، تو کبھی ہرگز کسی ایسی ہستی کو اپنی بیوی نہ بنائے جس سے وہ دراصل محبت کرسکتا ہو۔ فی الحقیقت شادی کرنا ہی اوّل درجہ کی نامعقول حرکت ہے، جو ہر نوجوان سے سرزد ہوتی ہے: پھر کسی ایسی شخصیت سے کرنا جس سے محبت ہو سکے ناقابل معافی گناہ ہے؛ بیوی اگر محض خدمت کرنے اور کھانا کھلا دینے کی خاطر کی جائے تو خیر ایک حد تک قابل برداشت ہوسکتی ہے، ورنہ قابل محبت بیوی ایک ایسی مصیبت ہے جو انسان کی تمام زندہ دلی، خوش اوقاتی، اور لطفِ صحبت احباب پر رفتہ رفتہ قابو حاصل کرکے انسان کو محض گھن چکر بنا دیتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہی اولاد بھی ہوتی رہی جو محبت کی صورت میں یقیناً ہوگی، تو بس غضب آگیا، ایک اچھا خاصہ ہنسنے بولنے والا شخص افکار و مصائب کا شکار ہوکر تھوڑے ہی عرصہ میں جانور بن جائے گا۔

دوسرا تجربہ۔ تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری کی ترقی ہے۔ تحصیلداری میں ماتحتوں کا لشکر اور حکومت کا میدان، سب کچھ حاصل تھا۔ کچہری من مانی چیز تھی۔ جی چاہا تو۔۔۔۔۔ دن تک کسی وقت پہنچ کر "فلاں حاضر ہے" کی آوازیں لگوادیں اور ایک گھنٹہ میں سیاہ سفید کرڈالا۔ اللہ اللہ خیر صلاح! میرا تجربہ یہ ہے کہ تحصیلداری کی مدت میں شاید تمام مقدمات میں سے ۵ فیصدی میں تجویز لکھنی پڑتی ہو، ورنہ سب صلحنامہ وغیرہ پر ختم ہوتے تھے۔ اب ڈپٹی کلکٹری میں "قیصر ہند اور ملزم" نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قیصر ہند بہ نفس نفیس ہر مقدمہ میں غیر حاضر رہتے ہیں اور ملزم ہر مقدمہ میں بذات خود حاضر ہوتا ہے، اگر معاملہ برعکس ہوتا تو غالباً مصیبت ہو جاتی۔ بہرحال صبح سے لے کر شام تک قیصر ہند اور ملزم کے باہمی کشمکش میں مبتلا رہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جس طرح مادّہ غیر فانی مانا جاتا ہے اسی طرح قیصر ہند اور ملزم کی باہمی نفرت و عناد بھی غالباً غیر فانی چیز ہے۔ مجھ سے اگر رائے لی جائے تو میں ضرور

کہونگا کہ تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری پر آنا ایسی دلچسپ حماقت ہے جیسے آزادی غارت کرنے کے بعد ایک عدد بیوی اپنے سر منڈھ لینا۔ دونوں یکساں طور پر نامعقول حرکات ہیں اور دونوں کے حصول کیلئے از بس تمنا و کوشش کی جاتی ہے۔ میں دونوں کو مثالاً بالکل ایسا سمجھتا ہوں جیسے ایک محصور قلعہ جس میں باہر والے اندر جانے کے متمنی ہوں اور اندر والے باہر نکلنے کے! ایسی حماقتوں میں بظاہر کچھ ایسی نظر فریبی اور دلگیری ہوتی ہے کہ اُن کا تاریک پہلو ہمیشہ ایک ناتجربہ کار سے نظر انداز ہو جاتا ہے اور تجربہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان خود پابہ سلاسل ہو چکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک "درد لذت آمیز"۔ یا۔ "لذتِ درد انگیز" سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ محض "حماقتِ نظر فریب"۔ یا۔ "نظر فریبِ احمق شکار" سے زیادہ نہیں۔

اس تمام مرثیۂ عدیم الفرصتی کے بعد، فرمائیے کہ مضمون نگاری کسطرح ہو؟

جن سوالات کا جواب طلب ہے۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ موقۂ فرصت پر دیا جائیگا۔ والسلام

اب تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرا پتہ کیا ہے۔؟ باندہ ــــ امید کرتا ہوں کہ آپ جغرافیہ کی امداد سے باندہ کے حدود اربعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ جھانسی کمشنری میں ایک ضلع ہے اور جھانسی کی شہرت ایک عرصۂ دراز سے زبان زد خلائق ہے۔ بلکہ آپ بھی اس کو جانتے ہونگے۔ صحیح ہے نا؟ فقط

باندہ ۲۹ دسمبر ۲۷ء

سُلطان حیدر جوش

برادر مکرم مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی بی۔اے۔ بی ٹی نے ازراہ کرم اولڈبوائے کی جانب توجہ فرمائی ہے۔ اور وہ اپنے وسیع حلقہ احباب میں سے برادران علیگڈہ کی فہرست مرتب فرما رہے ہیں۔ ڈائرکٹری کے باب میں ابتک "چہ کنم" میں ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگر آپ میرا ذکر ضروری ہی سمجھتے ہیں تو صرف اتنا تحریر فرما دیجئے کہ میں ۱۹۰۸ء میں علیگڈہ میں شریک ہوا، اور ۱۹۱۴ء تک وہاں رہا۔ ایف اے اور بی اے وہیں سے پاس کیا۔ اب سررشتہ تعلیمات میں ہوں"!

دل لوٹ کے آتا ہے

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
دل یہ جو ہمارا ہے
مانا کہ تمہارا ہے
چاہو تو یہ پیارا ہے
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
اک بات میں ہٹ جائے
اک بات سے کٹ جائے
اک بات میں پھٹ جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے
چاہو تو تمہارا ہے (۲)
چاہت کا یہ مارا ہے
چاہت کا ستارا ہے
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
لہجہ پہ بپھر جائے
تیور پہ بکھر جائے

اک حرف پہ مر جائے

احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

(۳) کیا کھیل ہے دل داری؟

یہ کھیل نہیں پیاری

ہے کام بڑا بھاری

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے

اِک آن میں لڑ بیٹھے

اِک پل میں اکڑ بیٹھے

اِک دم میں بگڑ بیٹھے

احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

(۴) یہ دل کا لگانا ہے

یہ خود کو مٹانا ہے

دل ہاتھ میں لانا ہے

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے

ٹسوؤں سے اٹک جائے

نظروں سے کھٹک جائے

ہنسیوں سے بھٹک جائے

احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

(۵) چاہت ہی صداقت ہے

چاہت ہی عبادت ہے

چاہت ہی شہادت ہے

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
اک بھول پہ رک جائے
اک چوک جو بھک جائے
پھر قصہ ہی چک جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

عظمت اللہ خاں مرحوم

قومی ہفتہ میں شرکت کرنیکی غرض سے مدراس آتے جاتے ملک کے متعدد مشاہیر حیدر آباد آئے تھے۔ آنریبل سر عبدالقادر ان کے منجملہ ہیں۔ شیخ صاحب کا قیام تو نواب صدر یار جنگ بہادر کے یہاں ہوا تھا، مگر ان کے اعزاز میں ہمارے برادر مکرم نواب فخر یار جنگ بہادر نے نظام کلب میں "کلو واشربو" کا اہتمام فرمایا تھا۔ ہمارے بھائیوں میں سے مولانا محمد علی اور قاضی بدرالحسن جلالی صاحبان کو بھی برادران حیدر آباد کی محبت ادھر کھینچ لائی تھی۔ مولانا کو ان کے شریک درس مسٹر محمد اصغر نے اپنے آغوش الفت میں لیا، اور مسٹر بدر جلالی جناب ترمذی کی شمع کاشانہ محبت بنے۔ احباب کی یہ گھڑیاں بہت لطف کے ساتھ کٹیں۔ بھائی قاسم حسن صاحب کی صحبت سے تو تمام احباب ایک بار اور اپنی سابقہ حالت پر عود کر آئے تھے۔ ان بزرگوار نے "ہمارا قل" بھی پڑھا تھا اور ساتھ ہی اولڈبوائے کے خزانہ کو بہت سے بھائیوں کی رقوم سے بھر گئے۔

ولایت سے واپس آنیوالے بھائیوں میں سے ایک صاحب کا اور پتہ چلا ہے۔ یہ ہماری عنایت فرما نواب عنایت جنگ بہادر کے بھانجے میر تجمل حسین خاں صاحب ہیں۔ انکی سیاحت یورپ نواب سالار جنگ بہادر کی معیت میں بالکل تفریحی تھی۔ ہم اپنے بھائی کو خوش آمدید کہتے ہیں اور نواب سالار جنگ بہادر کا خیر مقدم کرتے ہیں جو تین پشت سے ہماری علمی کشتی کو سہارا دے رہے ہیں۔

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(۱۵)

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

شعر صاف ہے اسلئے ہم کو شرح و شارح سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف مرزا بیدل کے اس شعر کو مکرر یاد دلانا چاہتے ہیں جو اوپر گزر چکا ہے یعنے ؎

شعلہ کاراں را بہ خاکستر قناعت کردنست ہر کجا عشق است دہقاں سوختن ہم حاصل است

دیکھیئے کہ مرزا غالب کے اس مطلب کو ادا کرنے کی یہ تیسری کوشش ہے اور چونکہ اس نقش ثالث کے تیاری میں انھوں نے صرف خیال بیدل کا لیا ہے اور ان کے الفاظ سے کوئی واسطہ نہیں رکھا ہے، جیسا کہ پہلے نقل شدہ دو شعروں میں ہے اسلئے انکی سعی مشکور رہی ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ "ناگزیر الفت ہستی" کہہ کر غالب نے اصل مضمون پر ترقی کی ہے۔

(۱۶)

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

شارح مدظلہ فرماتے ہیں "اس شعر میں ہائے یا تو علامت جمع و اضافت ہے یا کلمہ تاسف ہے۔ دونوں صورتیں صحیح ہیں"۔ میں عرض کرونگا کہ دونوں صورتیں بیشک صحیح ہو سکتی ہیں لیکن اگر مرزا غالب

جیسے اُستاد نے ہائے کو اس مقام پر بطور کلمہ تاسف داخل کرکے اچھے خاصے شعر میں بدنما تعقید اور اختلال بندش کو جایز رکھا ہے تو مقام تاسف ہے۔ فارسی علامت جمع کا استعمال مرزا غالب کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے پھر کیا معشوق نے غیر پر ایک ہی نظر ڈالی تھی؟ اور کیا صفت "تیز تیز" کی تکرار اور مصرع ثانی میں مژہ ہائے کہ جمع کے تقابل کے بعد بھی اس "ہائے" کے علامت جمع ہونے میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے؟ فافہم۔

(۱۷)

کاوشں کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

حاصل شرح یہ ہے کہ "دل (گرفتہ) ناخن غم سے کاوش کا تقاضا (قرضخواہ کی طرح) کر رہا ہے اور یہ کہ"۔ لفظ ہنوز اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ کاوش غم پہلے بھی ہو چکی ہے"۔

مگر میں کہتا ہوں کہ دل کو گرہ یا گرہ نیم باز کہہ کر اس کے کھولنے کی خواہش ناخن سے کرنیکا مقصود کشادگی و انشراح دل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ محض دل کی گرہ کھولنے کی خواہش ہی اسبات کی دلیل ہے کہ دل منقبض و گرفتہ ہے۔ ایسی صورت میں شعرا اتنے الفاظ اور چاہتا ہے۔ "کاوش ناخن (غم) سے واشدِ دل ہوتی ہے اس لئے کاوش کا دل کرے ہے تقاضا الخ" کاوشن ناخن سے واشدِ دل ہونے کی صراحت اس لئے درکار ہے کہ کاوش سے حقیقتاً صدمہ پہونچتا ہے اور صدمہ گرفتگی دل کا باعث ہوتا ہے پس یہ بتادینا ضروری ہے کہ قایل جو عاشق ہے اس کا دل کاوش سے گرفتہ ہونے کے بجائے شگفتہ ہوتا ہے۔ اسی مطلب کو مرزا بیدل نے کیا خوب ادا کیاہے۔ فرماتے ہیں ؎

عقدِ دل را ناخن آشفتگی وامی کند　　غنچہ می گوید بہ بلبل کاندریں گلزار داد

بہرکیف بہ صورت موجودہ شعر کے الفاظ شاعر کے مقصودِ ذہنی کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

(۱۸)

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں　　پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

شرح فرمائی ہے کہ "اگرچہ میں خاک نشین تھا لیکن میرا دل قناعت کے فخر و ناز کے سبب سے فرش سنجاب پر لوٹ رہا تھا۔ لیکن قناعت کا پہلو کسی لفظ سے نہیں نکلتا۔ ایک نازش کے لفظ سے نازش قناعت کے معنی لینا محض تاویل اور تاویل محض ہے۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ اگر پہلے خاکستر نشینی تھی تو اب مسند گزینی کہاں سے حاصل ہوئی؟ پہلے قناعت تھی تو اب حرص کیوں دامنگیر ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی ردیف مخل معنی واقع ہوئی ہے۔ اگر تھا کی جگہ ردیف ہے ہوتی تو مطلب حاصل ہو جاتا اور تقریر کے بزمانۂ حال ہونے سے قناعت کا مفہوم بھی نکل آتا۔

(۱۹)

گلیونہیں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں

جاں دادۂ ہوائے سر رہگزار تھا

شارح علامہ فرماتے ہیں کہ "رہگزار سے رہگزار معشوق مراد ہے" بیشک مراد تو یہی ہے لیکن کوئی لفظی قرینہ رہگزار کے رہگزار معشوق ہونے کا نہیں ہے۔ فارسی میں بھی ایسے مقام پر "سر رہگزارے" یائے تنکیر کے ساتھ کہیں گے اور اردو میں بھی یوں کہیں گے کہ "میں کسی رہگزار کی ہوا کا جاں دادہ تھا"۔

(۲۰)

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

شرح "قاعدہ ہے کہ آئینہ میں ایک ہی عکس دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب اسے توڑ ڈالو تو ہر ٹکڑے میں وہی پورا عکس معلوم ہونے لگتا ہے! اور یہاں ایک ایک عکس کو دیکھ کر ایک ایک آرزو کا خون ہوتا ہے۔ غرضکہ جس آئینہ میں معشوق کے عکس و تمثال کا جلوہ تھا اس کے ٹوٹنے سے یک شہر آرزو کا خون ہو گیا"۔ اور نظیراً یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

نظر آئے کبھی کاہیکو اک جا خود نما اتنے

یہ حسن اتفاق آئینہ ان کے روبرو ٹوٹا

اس شرح سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ حقیقی معنو میں ہے لیکن اسی کے ساتھ شرح و متن میں کسیقدر بعد بھی ضرور ہے۔ اب حضرت شوکت میرٹھی کی سنیے وہ کچھ اور ہی راگ گاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:" یہ شعر اہل فرنگ کے مذاق کے موافق لکھا ہے۔ انہیں یہ دستور ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کی تصویر منگا کر اپنے پاس رکھتے ہیں، شادی بیاہ وغیرہ کے لئے یہ رسم زیادہ رائج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے جو آئینہ یعنے جو گھٹا توڑ ڈالا جس میں میری تصویر تھی تو اب میں اپنی آرزو کا ماتم کر رہا ہوں کیونکہ آئینے کے قایم رہنے سے مجھے وصل کی آرزو تھی یا یہ خیال تھا کہ تجھے مجھ سے محبت ہے" مگر شارح کو اس شرح پر وثوق نہیں ہے، پھر لکھتے ہیں:" یا یہ معنے ہیں کہ میرے پاس جو تیری تصویر کا آئینہ تھا جب تو نے اسے توڑ ڈالا تو مجھے انتہا درجہ کا غم ہوا کیونکہ اپنے دل کی آرزو اسکے نظارے سے پوری کر لیتا تھا۔ ماتم یک شہر آرزو۔ انتہا درجہ کا ماتم یعنے اس غم میں میرے ساتھ ایک شہر آرزو ماتم کناں ہے"!

مجھے حیرت ہے کہ ایک صاف سے شعر کو "قیل معنے" بنا یا گیا ہے۔ پہلا مصرعہ محض بیان واقعہ ہے تو شاعر کہتا ہے کہ اب میں ماتم دار آرزو ہوں، یک شہر آرزو کثرت آرزو کے لئے ہے۔ چونکہ دل ہی آرزوں اور تمناؤں کا گھر یا شہر ہوتا ہے اس لئے ماتم دار آرزو ہونا اسکی دلیل ہے کہ شہر آرزو (دل) ویران و برباد ہو گیا ہے (آرزوں کے مٹ جانے سے) دوسرا مصرع پھر اسی بیان کی توضیح میں ہے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ تیری وجہ سے (یہ اشارہ ہے معشوق مخاطب کی طرف) کیونکہ تو نے میرے دل کو توڑا ہے، کیسا دل جو آئینہ تھا اور کیسا آئینہ جو تمثال دار تھا۔ یہ سب استعارات ہیں اور ان میں کوئی نیا استعارہ نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے دل کو خالی آئینہ نہیں کہا بلکہ تمثال دار آئینہ کہا اسلئے کہ اس کا مقصود دل پر آرزو تھا۔ مثال کتنی بدیع ہے۔ ظاہر ہے کہ آئینہ سادہ ہے تو ویران ہے اور اسمیں عکس یا تمثال ہے تو آباد ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ او ظالم جس آئینے کو تو نے توڑا وہ آباد (تمثال دار) آئینہ تھا۔ مدعا یہ کہ جس دل کو تو نے ویران کیا وہ دل ے مدعا نہ تھا بلکہ یک شہر آرزو تھا جس کا نتیجہ ہے کہ

میں جو پہلے وابستۂ آرزو تھا اب ماتم دار آرزو ہوں، میں جو تجھ سے امیدیں رکھتا تھا۔ اب ناامید ہوں
اس شرح میں حضرت والد مرحوم (صاحب وثوق صراحت) ایک حد تک میرے ہمخیال ہیں۔ انکی شرح ہے کہ
"میرے آئینہ دلمیں تیری صورت تھی جس سے ہزاروں آرزوئیں زندہ تھیں۔ آئینہ دل جو ٹوٹ گیا تو وہ صورت مٹ گئی
آرزوئیں مردہ ہوگئیں"۔ مجھے مرحوم سے صرف اسقدر اختلاف ہے کہ جب بلا زیادتی الفاظ معنے نکل آتے ہیں تو صورت
بنانے اور بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا روزمرہ کا محاورہ ہے۔ دل توڑنا اور دل ٹوٹنا جب کوئی کسی کے خلاف
آرزو اور خلاف امید کام کرکے اُسے روحانی صدمہ والم پہنچاتا ہے تو کہتے ہیں کہ تونے میرا دل توڑ دیا۔ صورت
صورت کی ضرورت اسلئے بھی نہیں ہے کہ بندۂ آرزو تمنا وغیرہ جذبات نفسانی کو یوں بھی بتوں سے تعبیر کیا گیا ہے
جو خانۂ خدا (دل) کو ناپاک کرنیوالے نقوش ہیں۔

(۲۱)

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مطلب واضح ہے۔ مگر اعتراض یہ ہے کہ ہلال تنگی وزن سے نہ آسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہگیا۔ اسلئے کہ شمشیر کا
عریاں ہونا ہلال (عید نظارہ) کے دکھائی دینے سے مشابہت رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عید کا لفظ آجانے
سے شمشیر کے عریاں ہونے میں ایک صورت استعارہ نمود ہلال کی خود ہی پیدا ہوجاتی ہے۔ نیز اگر ہلال عید نظارہ
اور شمشیر عریاں میں نسبت تشبیہہ فرض نہ کی جائے تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ اس مصرعہ کو محض بیان واقعہ تصور
کرسکتے ہیں۔ معشوق قتل گاہ میں عاشقوں کے قتل کو برہنہ تلوار لیکر آیا۔ ان دیوانوں کو اپنے قتل کئے جانے کا
تورنج نہ ہوا اور خوشی اسبات کی ہوئی کہ خیر اسی حیلہ سے ہم کو روے معشوق کا نظارہ تو نصیب ہوا۔ لگے
اچھلنے کودنے اور عید منانے ع دیوانوں کی باتیں ہیں دیوانے کو کیا کہئے۔

ضامن کنتوری

شامِ غریباں

شوکتِ مسلم گئی نکبت کے ساماں دیکھیے
دیکھ لی صبحِ وطن شامِ غریباں دیکھیے

انقلابِ گردشِ گردونِ گرداں دیکھیے
موم کی قینچی ہوئی تیغِ صفاہاں دیکھیے

جان و مال و جاہ و عزت کا نگہباں ہے خدا
سو رہے ہیں سب درِ دولت کے درباں دیکھیے

موج بڑھتی جا رہی ہے بحرِ طوفاں خیز ہے
ڈگمگاتی جاتی ہے کشتیِ ایماں دیکھیے

پھول پھل کیا۔ خار و خس کیا خاک تک چھوڑی نہیں
لٹ گیا کس نوع سے سیرِ گلستاں دیکھیے

اک سرِ شوریدہ ہے اور اس میں سودے ہیں ہزار
ایک دل ہے اور کئی ہیں اس کے خواہاں دیکھیے

پڑ گئی آنکھوں میں مٹی بادِ تند ایسی چلی
اڑ رہی ہے زلف و حسنِ جاناں دیکھیے

شربتِ دولت ہوا ہے جرعۂ زہرِ فنا
واپسیں دم۔ اور یہ حالِ طبیباں دیکھیے

مانگ کر بھی لے گیا جیسے۔ چرا کر بھی لیا
اور پھر الٹا جتاتا ہے وہ احساں دیکھیے

ایسی غفلت ہے کہ کانٹوں پر بھی آئی ہم کو نیند
اب نظر آتے ہیں کیا خوابِ پریشاں دیکھیے

کاہلی بے ہمتی پابندیِ رسمِ فضول
جمع ہیں ساری پریشانی کے ساماں دیکھیے

بے کفن لاشیں ہیں ہم زندہ ہمیں کہتا ہے کون
گھر نہ کہیے۔ حالتِ گورِ غریباں دیکھیے

انقلابِ دہر یہ ہے آج طفلِ نے سوار
زعم میں اپنے بنا ہے مردِ میداں دیکھیے

ہم وہ عالی فہم ہیں۔ شاگردِ اُستادِ ازل
بحث ہم سے کرتے ہیں طفلِ دبستاں دیکھیے

روشنی کچھ رہ گئی۔ لٹ گیا سامانِ عیش
بن گیا تارا گُلِ شمعِ شبستاں دیکھیے

مجکو سیر داغہائے سینہ سے فرصت کہاں — آپ ہی رنگ و بہار باغ و بستاں دیکھئے
کیا ہوئی وہ آپ کی لطف و عنایت کی نظر — پھر اُسی انداز سے سوئے غریباں دیکھئے
اک مجلد خوشنما تاریخ کا ناقص ورق — دیکھنا ہو تو ذرا حال مسلماں دیکھئے

سربسر افسانۂ عبرت ہے شہرت حال بد
چاکِ داماں دیکھئے۔ تار گریباں دیکھئے

(شہرت)

گزشتہ حیدرآباد لیڈیز کانفرنس میں جو زیر صدارت لیڈی بارٹن منعقد ہوئی تھی، جن خواتین نے عملی حصہ لیا، اُن میں مسز صوفی بی۔اے بھی ہیں۔ اس موقعہ پر مسز صوفی نے شریک معتمدی کے فرائض انجام دے تھے۔ ان کے شوہر مسٹر صوفی ہمارے کالج کے فرزند اور سرکار آصفیہ کے محکمہ عدالت کے عہدہ دار ہیں۔ مسز صوفی نے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے دونوں امتحانات میں مسلم یونیورسٹی سے کامیابی حاصل کی ہے۔

اس مرتبہ جشن نوروز کی خوشی میں جن شخصیتوں کو خطابات ملے ہیں، ان میں اولڈ بوائز نے بھی بقدر جثہ حصہ پایا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب رئیس حبیب گنج، چودھری سید عبدالحسین صاحب سشن جج اعظم گڑھ، اور مولوی ظفر حسن صاحب، خان بہادر ہوگئے۔ اول الذکر ہمارے نواب صدر یار جنگ بہادر کے خلف الرشید اور "الولد سر لابیہ" کے مصداق ہیں، اور اوسط الذکر، مع کالج کی ادبی و قانونی ڈگریوں کے ایس ایک سرکاری سشن جج۔ مولوی ظفر حسن صاحب اب اولڈ بوائے کو بھول گئے، ورنہ وہی تھے کہ کبھی "التمش" اور کبھی "پنچ" پر اپنے اس رسالہ کے لئے خامہ فرسائی کیا کرتے تھے۔ یہ بڑی بات ہوئی کہ خانصاحبی کے درجہ سے نکل کر اب بہادری کے طبقہ میں آگئے۔ انکی جگہ مسٹر کمال نے لی ہے جو میونسپل بورڈ فتح پور کے چیرمین ہیں۔ ہاں! یادش بخیر! بھائی محمد ذکی صاحب بی۔اے ایل ایل بی وکیل سرکار گورکھپور بھی قابل ذکر ہیں کہ ایک جانب انھیں خاں بہادری کی سند حاصل ہوئی اور دوسری طرف پنڈت تیج نرائن ملا صاحب کی سعی سے ہمارے بھائی گورنمنٹ ایڈوکیٹ بنا دیے گئے۔ ان سب بھائیوں کو ہم مبارکباد دیتے ہیں۔

تائیس دِلّی میں

تائیس* کو دنیا بھول سا گئی تھی۔ کیونکہ صدیاں ہی گذریں کہ یہ سماجی پھول کھلکر کملا یا۔ ہے بھی ٹھیک مصر و یونان کی اتنی پرانی باتیں کہ جب سکندر اعظم کی شہرت شباب پر ہو، بہت کم شاید ایسی ہوں تو ہوں جو چھینے سے اُتری نہ ہونگی، ورنہ مثل مشہور ہے رات گئی بات گئی۔ بہت ہوا تو آنیوالوں نے اپنی مہربانی سے تاریخ قدیم کے صفحات کی انھیں زینت بنا دیا جس سے بجائے یاد کے وہ الماریوں میں زیادہ خوبصورتی سے محفوظ ہیں، نہیں تو زمانہ کا سفاک ہاتھ انھیں میٹ دینے میں کبھی کمی نہیں کرتا۔ حضرت آدم کی بڑھتی ہوئی پر نظر دوڑائیے، کائنات کی اور چیزوں میں شاید ہی اتنی برکت ملے تو ملے۔ کاش! ہر نافرمانی کا پھل اتنا بابرکت ہوا کرتا!! مگر اس "زود فرزند" کے معاملہ پر بھی صرف گنتی کے ایسے نظر پڑتے ہیں جو یاد رہجاتے ہیں، اور جیتے جی نہیں بھولتے ورنہ باقی اور سب کیسلئے تو قسم کھا کر ہی کہنا پڑتا ہے کہ پیدا ہوئے تھے۔

تائیس بھی اس اٹل اصول کے کام آگئی تھی۔ مگر اناطول فرانس کی دنیا دیکھی نظر نے پالیا اور اس میں پھر جان کی ایسی گرمائی ڈالدی کہ رہتی دنیا رہے گی۔ اس بزرگ کی نظروں سے تائیس کو دیکھئے گا تو ایسا معلوم دیگا، زندگی کی پر بہار سیج ہے جسپر ایک دلہن پڑی لطف و انبساط کی کروٹیں بدل رہی ہے! جو اول اول اگر عیش و عشرت کی کفیل تھی تو بعد میں" تو یہ و استغفار کے آنسوؤں" سے نکھر کر کچھ سے کچھ بن گئی ہے۔ عجب نہیں جو اس پیارے منظر کی لطیف گنگا جمنی دیکھکر پھنوتوس کی طرح آپ بے تاب ہو جائیں مگر ساتھ ہی

---

* "تائیس" مصنفہ موسیو اناطول فرانس و مترجمہ جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔اے (علیگ)

منہ سے یہ بھی نکل جائے گا کہ اس سمجھ کے بیٹے کا سا انجام خدا دشمن کو بھی نصیب نکرے!

انیسویں صدی عیسوی فرانس نہیں یورپ بھر میں علم و ادب کی بڑی مبارک صدی گنی جاتی ہے۔ موسیو اناطول اس کا نچوڑ تھا۔ اس لئے ہر رنگ میں رچا ہوا گر بلا کا سادہ و پرکار یا خود ایک کیرکٹر تھا اسواسطے ایک خاص اسٹائل کا مالک بھی تھا۔ طبع خداداد کی جدت وجودت سے جو بات کہی انوکھی، جچی تلی، اور نڈر نکر۔ ساتھ ہی اس اہتمام سے کہ سننے والے کے دلمیں اُتر جائے۔ نظر بھی بلا کی گہری پائی تھی۔ ذہانت اور استعداد علمی کے کمال کا بھی یہ عالم ہے کہ جس مشکل سے مشکل بات کو لیا پانی کردیا (Temps) کے نت نئے جواہر پارے اور اسکی دوسری چیزیں دعوے کی بیّن دلیل اور ایسے خوش آب موتی ہیں جنکی روشنی سے دل و دماغ جگمگا اٹھتا ہے! اسکی سنگت سدا بہار ہے جس سے جی کھلتا ہے اُکتاتا نہیں۔ اسکے انداز خصوصی میں کبھی کبھار تلخی بھی آجاتی ہے گر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاید مٹھاس کی زیادتی ہو! اسکے شفاف اور خوش آیند اسٹائل کا روح کی بالیدگی پر ایسا لطیف مگر پائیدار اثر ہوتا ہے جیسے ساون ماس کی ہلکی ہلکی پھوار کا زمین کی قوت نامیہ پر! جو انجان کی گہرائیوں میں اتر کر گیان کے کنول کھلاتی ہے! اسکی روح ایک ایسا آبدار ہیرا ہے جس کے بے گنتی پہل ہیں اور ہر پہل اک نرالی جوت والا ہے!

تائیس مصر سے فرانس آکر ایسی خوبیوں والے مصنّف کے پاس رہی جسکے فیض صحبت سے اچھے اچھوں کے کان کاٹنے لگی ہے! پفنوتوس اس کا روحانی چاہنے والا اپنے آپ کو بڑا عالم باعمل اور پہنچا ہوا جانتا ہے۔ ایکدفعہ بڑی ہمدردی جتا کر اسے پُربہار طرز زندگی سے روکنا چاہتا ہے۔ یہاں تائیس کا منہ توڑ جواب سُنکر اندازہ لگائیے کہ یہ کس لخلخہ اور حوصلہ کی عورت بن گئی ہے!

"کیا خوب! خدا کو کس نے مجبور کیا ہے کہ میری ہی خلوتگاہ کو ہمیشہ گھورتا ہے۔ اگر کوئی بات اُسے ناراض کرتی ہے تو نہ دیکھے ہٹ جائے! لیکن ناراض ہی کیوں ہو۔ اگر اُسنے ہمیں پیدا کیا ہے تو پھر جیسا بنادیا اور جسطرح اسکی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہمارے اعمال ہیں اُنپر بگڑنے یا حیرت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہت سی باتیں اسکی طرف سے بنا کر کہہ دی جاتی ہیں اور بہت سے خیالات اسطرح بیان کئے جاتے ہیں گویا خدا سے قرض مانگ لائے ہیں حالانکہ وہ اسکے پاس کبھی تھے ہی نہیں! پہلے اسکی حقیقت تو پہچان لو۔

تم کون ہو؟ جو اسکے وکیل بنکر میرے پاس آئے ہو!"

ذرا زورِ استدلال دیکھئے گا خیال کیلئے ظالم نے کیا باقی رکھا!

خیر! تائیس کو یا تو یوں دزانہ یورپ میں رہتے سہتے دیکھا تھا یا یکا یکی دلّی میں نظر پڑی۔ آڑا پیجامہ، صوفیانی دوپٹہ اور زلف بردوش! حیرت سی حیرت تھی کہ الٰہی! ہمارے ہاں ایسا کونسا منچلا نکلا کہ خیالات سے مالا مال تائیس کو لبھا کر اناطول فرانس جیسی جید ہستی سے یوں چھین لے آیا لیکن معلوم ہوا یہ خوش صفات مترجم کی کارستانی ہے!

جناب مترجم ترجمہ کے مالک ہیں۔ اور آج سے نہیں ایک زمانہ سے دنیائے اردو کے روشناس ہیں۔ اردو تو خیر گھر کی ہے۔ انگریزی کو بھی گھر میں ڈال لیا ہے! جب جی چاہا اسے دلی کا پہناوا پہنا دیا۔ پھر اس سلیقہ سے کہ دیسی بدیسی کا امتیاز باقی نہیں رہتا! آپ نے سرسیّد مغفور کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ پرچینگ آف اسلام، کپلنگ کی جنگل بک والی دو کہانیاں، وغیرہ بھی اردو کی ایسی نمایاں چیزیں ہیں جو بھلائے نہیں بھول سکتیں۔ غرض آپ علی گڑھ کی مادر علمی کے ایسے قابل قدر سپوتوں میں سے ہیں جو اچھے ادیب، اچھے مترجم اور اس لئے اچھے علیگ ہیں جنھوں نے اپنے فطری ذوق ادب اور رنگ خاص کو ابھار کر اتنا اٹھا گو کیا کہ اس سے ایم۔ اے۔ او کالج کی عظمت قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے جو غالباً بی تائیس بھی ادھر آ نکلی ہیں!

تائیس کا بڑا مزہ دار قصہ ہے جس میں انوکھے مصنف نے نئے نئے قرینے برتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ سکندر اعظم والے اور دراز زمانہ تک بلا تامل آپ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ پھر اس بے تکلفی سے کہ اس زمانے کو عین میں سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ جو ظاہر ہے آسان کام نہیں۔ کیوں کہ یہاں مصنف کی روح کو اتنا سکتہ دار اور غواص ہونا پڑتا ہے کہ استاد کی تہیں کھنگو لکر گوہر مقصود لے آئے گھبرائے نہیں۔ خیر! اسے بھی جانے دیجئے۔ کتاب کا موضوع خود ایک نئی نویلی، وسیع، وزنی اور اعلیٰ چیز ہے۔ جسے مصنف رہبانیت کے شل کر دینوالے رنگ میں پیش کرکے اچھا خاصا ایک سنجیدہ مسلمان بن گیا ہے! سارے قصہ میں ٹیپ کا بند فلسفۂ عدم تکمیل خواہش ہے یعنی بالفاظ غیر قدرت کی پیدا کی ہوئی کوئی شے بیکار نہیں۔ اسلئے اُسے بے کار رکھنا یا قصداً بے کار کرنا قدرت سے کھلی جنگ ہے۔ جہاں وہ آنکھ بند کرکے ٹھکرا دیا کرتی ہے، وہ صاف ہے۔ انسان کی

بے گنتی خواہشات جو غیب سے بگٹ لپٹی چلی آتی ہیں، اور جو ویسے بھی نسلاً بعد نسلٍ توارث کا زور پا رہی ہیں، قوت کا مظہر ہوتی ہیں۔ قوت کو ٹھیک راہ لگا کر اُسے سونا اور چیز ہے مگر اس کو دبا دبا کر یہ چاہنا کہ وہ مٹ جائے بعین حماقت ہے جس سے بجائے قابو میں آنے کے وہ اور بچل جایا کرتی ہے۔ اس صورت میں ایک راہب کا یہ چاہنا کہ خواہشات نفسانی مطلق میٹ دی جائیں بالکل خلاف فطرت اور اس لئے فطرت سے خوفناک جنگ کا الٹیمیٹم ہے۔ یوں دیکھتے ہیں یہ خواہشات بڑی حد تک دبی ہوئی معلوم دیں گی، لیکن اصل میں روئی کی آگ بن جاتی ہیں۔ جو اندر اندر سلگ کر اچھی بھی روح کو انتشار اور بے اطمینانی سے اتنا کھوکھلا کر دیتی ہے کہ ایکدن زہد و تقدس کا شاندار ایوان مبارک دھڑام سے قدموں میں آ رہتا ہے! پفنوتوس بھی اسی بد توفیقی کا شکار ہے!

تصویر کا دوسرا رُخ تائیس ہے۔ قطع نظر اس کے کہ تائیس کا طریق تکمیل خواہش اعتراض کے قابل ہے۔ یہ قوای فطری کے ارتقا میں روڑا نہیں اٹکاتی۔ انہیں بقائے ذات کے لئے مشق کرنے دیتی ہے۔ چنانچہ کنٹھ نکلنے یا سینہ اُبھرنے کے بعد کے جو نفیس اور ضروری جذبات و خواہشات ہیں، ان سے بتقاضائے فطرت سیر ہو کر پفنوتوس کی نظروں میں گو یہ بدترین ہستی بن جاتی ہے مگر لطف یہ ہے انھیں قابل نفرین برائیوں اور ناقابل معافی زیادتیوں میں یکایک یہ ایسا ردعمل بھی محسوس کرتی ہے کہ ایک اشارہ میں رحمت الٰہی اسے ملاء اعلیٰ تک اٹھا لیتی ہے! صورت حال جب یہ ہو تو فرمایئے انجام کار کون جیتا رہا! وہ بن باس راہب جو روتا آیا اور روتا ہی رہا یا خوش عیش تائیس جو ہنستے کھیلتے زندگی بسر کر کے ہنستی کھیلتی ہی سدھار گئی!

اصل تصنیف کی طرف میں اس سے زیادہ اشارہ نہیں کرونگا۔ تصنیف کا وقار چاہتا ہے کہ اناطول فرانس سا عالم و ادیب جس چیز کو بیسیوں صفحوں میں پھیلائے جس میں تائیس سی لُحلُمہ کی عورت، اپولیوس سے سیاح، تیقر دسے عالم، ڈوموس تھئینس سے خطیب، ابی قورا اور رفار فریوس سے فلسفی اور ہرقلس سے مُدبر سے آپ دوچار ہوں جس میں زبان و خیال کا گلزار پڑا لہلہا رہا ہو اُسے صرف ڈیڑھ صفحے میں گھونٹنا خاک میں ملا دینا ہی۔ اس کا مزہ تو اسی وقت پورا پورا ملیگا کہ آپ ہوں جناب مصنف و مترجم ہوں اور سب ملکر یکجا ہوں۔

صحرا کی سیر کو نکلیں۔ دریائے نیل کے کنارے کنارے اتنی چہل قدمی ہو کہ وہاں ایک آدھ صبح شام بھی ہو جائے۔ مذاہب و راہبات سے ملئے، ان کی حرکات و سکنات دیکھئے جس سے یہ اندازہ ہو کہ دنیا میں کس کس قماش کے لوگ آباد ہیں۔ اسکندریہ کے گلی کوچے بھی آپ خود چھانیں۔ حتیٰ کہ تائیس والے تماشہ گھر میں جا پہنچیں، جس میں نامور اور حسین رقاصہ کی حیثیت سے وہ وینس، لیدا اور تھیبی کا بہروپ سے کر نغمۂ حیات بن بن جاتی ہے! اسی ہنگام عیش میاں پفنوتوس بھی تھرتھرائے کپکپاتے آپ کو نظر پڑیں جو وہاں خیر سے وعظ کہنے آئے ہیں! زبان پر توبہ و استغفار ہے مگر دل کا خدا حافظ ہے، اور آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی ہیں کہ "تائیس لیدا ویسی کیطرح سنبل کی سیج پر لیٹی ہے۔ منہ اونچا کئے ہوئے ہے، آنکھیں روشن اور نم ہیں، نتھنوں کو حرکت ہوتی ہے چھاتیاں ابھری ہوئی ہیں، اور دونوں بازو اسطرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے عشق و الفت کے دو چشمے رواں ہوں! جسے دیکھ کر پفنوتوس سینہ کوٹ لیتا ہے!" اسکے بعد اور بھی کوڑیوں خوشنما منظر آپ کی نظر سے گذریں گے جو ایک سے ایک بڑھا چڑھا ہو گا۔ ایک جگہ آپ کو دکھائی دیگا کہ میاں پفنوتوس کی گت بنائی جا رہی ہے، اور تائیس انھیں چٹکیوں میں اڑا رہی ہے۔

"کرم فرما! یہ تو بتائیے کہ جس عشق کا آپ ذکر کرتے ہیں، اس کا اتا پتا کیا ہے، یہ جنس کہاں ملتی ہے؟ ذرا جلد فرمائیے، تقریر کو طول دینے سے میرا حسن میلا ہوتا ہے! وقت ضائع نہ کیجئے جس عیش و نشاط کی خبر آپ لیکر آئے ہیں، میں اسکے معلوم کرنے کی بے حد مشتاق ہوں لیکن اگر آپ صاف کہلواتے ہیں تو سن لیجئے۔ میں ایسے عیش و نشاط سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ آپ کے یہ سب دعوے آپ کے فقروں ہی تک رہیں گے۔ آپ سے عشق کا وعدہ کرنا جو ہمیشہ رہے، آسان ہے۔ مگر اس کا ایفا مشکل ہے۔ دنیا میں ہر شخص کوئی نہ کوئی وصف رکھتا ہے۔ آپ کا جوہر کشف ہے۔ آپ ایسے عشق کی خبر دینے آئے ہیں جس کا آج تک کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ سنئے یہاں تو بازار حسن میں بوسوں کا لین دین اتنی مدت سے جاری ہے کہ کسی قسم کا عشق بھی ایسا نہیں جس کا راز ہمپر نہ کھل گیا ہو، یہ باتیں عاشقوں سے پوچھئے۔ آپ جادو ٹونے کے آدمی ان باتوں کو کیا جانیں!"

تائیس کی یہ باتیں دل لگی ہی سہی، مگر ایک رائے ہے۔ جو دکھا دے کہ "جبہ و دستار" اور اس زعم باطل کو ٹھکرا دیتی ہے کہ زہد و تقدس کی چار دیواری ہی میں فضل الٰہی محدود ہے!

انتہا یہ کہ اسکندریہ کے سامعین کے اُس خوبصورت چاند کو پفنوتوس سے گہنا کر آپ ڈوب ہوتا دیکھیں جس سے کنگلے، فقیروں، محتاجوں اور بھوکوں کی دکھیاری دنیا بے نور ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں کہ بجائے یہاں کے وہ پھر تھیبی کے صحرا میں طلوع ہوا ہے مگر ہمیشہ کو غروب ہونے کے لئے! غرض "صبح ازل کی روشنی" میں جوں جوں تائیس موت کی سیڑھی سے قریب تر ہوتی جائے تا کہ ارتقائی روحانی کی ایک اور منزل طے کرے، تو پفنوتوس کے دل کی کلونس اور زیادہ اُجاگر ہوتی نظر آئے حتیٰ کہ تائیس کی پتلیاں پھریں اور لڑکھاتی زبان پر یہ وداعی الفاظ آپ کو سنائی دیں!

"عرش کے دریچے کھل گئے ہیں۔ ملائکہ انبیا، اور خدا کے اولیا نظر آرہے ہیں۔ مقدس لیدوا شہید، میرا پاک آحسس بھی اُن ہی میں ہے؛ اور اُس کا ہاتھوں میں پھول ہیں۔ وہ ہنستا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔ دیکھو۔ وہ دو فرشتے بڑھے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔ لو۔ وہ آگئے۔ کیسے خوبصوت ہیں۔۔۔۔۔۔۔ خدا کا دیدار شروع ہوگیا"!

ساتھ ہی منہ سے ایک خوشی کا نعرہ نکلے اور تائیس ہمیشہ کیلئے میٹھی نیند سو جائے اگر پفنوتوس سچائی کی اس روشنی سے چوندھیا کر "خفاش" بن جائے!! گویا!

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہِ نیاز بدار السّلام رفت

کی ہو بہو تصویر آپ کی نظروں میں پھر جائے!

ترجمہ کے متعلق لگے ہاتھ چند لفظ اور سُن لیجئے۔ پھر یہ طول کلامی ختم ہے۔ ترجمہ کرنے کو سب کر لیا کرتے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ بچوں کا کھیل نہیں۔ چیدہ چیدہ ہستیاں ہی اس سے نبرآ ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ترجمہ کی بعض صورتیں اصل تصنیف سے زیادہ مشکل مانی جاتی ہیں؛ کیونکہ تصنیف میں آزادہ روی ہوتی ہے۔ جیسا جی چاہا جسطرح بن پڑا، خیال ادا کردیا گیا۔ برخلاف اسکے ترجمہ میں ایک چیز سامنے ہوتی ہے جس سے ہٹنا تو درکنار اسکے سایہ سایہ آپ کو چلنا اور سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ مشکل اردو کی کم مایگی سے اور بڑھ جاتی ہے؛ جہاں دوسری رودار زبانوں کے ایسے مالا مال خیالات اور نت نئی ترکیبوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جس نے غریب اُردو مانوس نہیں۔ ادھر ترجمہ کی خوبی یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنی ساری سوہنی نفاست کیساتھ اس صفائی سے بھیس بدلکر گھل مل جائیں کہ پہچانی نہ جائیں، جو ظاہر ہے آسان کام نہیں۔ موسیوانا طول فرانس کے ساتھ یہ مشکل بہت بڑہجاتی ہے کیونکہ یہ اپنے انداز تحریر میں سہل الممتنع ہے۔ اور ہر وقت خیال کے نور میں ڈوبا ہوا۔ ان خوبیوں والے مصنف کی بال سے باریک اور بلور سے نازک تحریر کو اردو میں لانا بڑا خون جگر پینا ہے۔ جناب مترجم نے یہ کڑی جھیلی ہے۔ ایک جگہ مصنف و مترجم یوں زلف و شانہ ہیں کہ "بی تائیس گڑ کر بنی ہیں اور میاں پفنوتوس باوجود جگر سوزی زیادہ سے زیادہ جادوگر بنے ہوئے ہیں۔ تائیس اس شخص پر بھی لوٹ کا وہ منتر پھونکنا چاہتی ہے جسکے آگے اچھے اچھے سورماؤں کے گھٹنے ٹک گئے ہیں! قصہ کے اس خوبصورت اٹھان پر ذرا اُن دونوں خوش مزاج ادبی سادہ کاروں کی بہار اور کھلاوٹ دیکھئے گا۔

"تائیس کچھ رُک کر شرما کر تین چار قدم پیچھے ہٹی اور پھر جلدی سے اپنی زرنگار سہری کی پٹی پر پاؤں لٹکا کر ہو بیٹھی۔ محرم کو بڑے انداز سے درست کیا اور بالکل خاموش آنکھیں نیچی کئے انتظار کرنے لگی۔ خوبصورت آنکھوں کی بڑی بڑی پلکوں کا سایہ رخساروں پر پڑتا تھا۔ گورے گورے برہنہ پاؤں زمین سے اونچے تھے۔ چہرہ پر شرماہٹ تھی، اور صورت سے معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی بھولا بچہ دریا کے کنارے بیٹھا ہو!"

تائیس کی وجہ سے اسے خوش صفات مترجم کی ہیں امنگوں بھری کیفیت نہ سمجھ لیجئے گا، ترجمہ ہے!!

سیّد وزیر حسن

ہم جناب حکیم برہم صاحب کے بہت بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری برادر مکرم قاضی تلمذ حسین صاحب کی صحت کی جانب توجہ فرمائی ہے۔ خوشی اسی بات کی ہے کہ بھوک کھولنے کی دوائیاں تجویز کی گئی ہیں، جس سے اب ہیں خود قاضی صاحب سے زیادہ انکے احباب فکرمند پائے گئے ہیں۔ حکیم صاحب اپنے معالجہ میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں موقعہ ملے گا کہ حضرت جوشش اور جناب ہو دودی کو مبارکباد دیں۔

کلامِ ضامنؔ

(۱)

آہ! کہ جامِ غیر سے وقفِ شرابِ وہم ہوں
میری فنا و فا نہیں مستِ خرابِ وہم ہوں

ہوش و خرد کی پیروی عیشِ دوام کھو چکی
محو ہے درسِ بیخودی محوِ کتابِ وہم ہوں

حاصلِ دشتِ جستجو! خاک بہ فرقِ آرزو
چاک ہے جیبِ تنگِ بو گل بحجابِ وہم ہوں

بسکہ ہے سیمیا نمود میرا کمال ہست و بود
سایۂ پیکرِ وجود نقش بر آبِ وہم ہوں

میں ہوں خزاں نہ ہوں بہار گل ہیں چمن کہاں ہو زغا
پرتوِ شمعِ اعتبار عکسِ حجابِ وہم ہوں

حیرتِ مدعا نہ پوچھ آئینہ میں ہے کیا نہ پوچھ
شوقِ ہوس گلا نہ پوچھ خانہ خرابِ وہم ہوں

ضامنؔ شوقِ منفعل حسرتِ عیش سے خجل
سعیٔ پیچ و تابِ دل موجِ سرابِ وہم ہوں

(۲)

ایک سے از خدنگِ ناز لنگ پیادہ ایک ہے
دیکھیں ہو کس کی راہ طے منزل و جادہ ایک ہے

ہیں دلِ عاشق و رقیب صادِ نظر کے منتظر
ایک پہ ہیں ہزار نقش صفحۂ سادہ ایک ہے

تیر میں توڑ چاہیے ہاتھ میں زور چاہیے
ورنہ کمان ارجنی اور کبادہ ایک ہے

مسند و تخت و بوریا آج ہیں وجہِ امتیاز
شاہ و گدا کا بعدِ مرگ فرش و وسادہ ایک ہے

گو نہوں شیخ و برہمن ایک کر اک رفیقِ کار
مقصد و مدعا ہے ایک قصد و ارادہ ایک ہے

نکتہ شناس جمع ہیں ضامنؔ ہرزہ گو خموش
فضل و ہنر میں ایک سے ایک زیادہ ایک ہے

(۳)

یا بیخودیِ شوق کا شکوہ نہ کیجیے — یا مجھکو اس نگاہ سے دیکھا نہ کیجیے

ہاں! عشق کر کے عشق کا چرچا نہ کیجئے — یہ زندگی کا راز ہے، افشا نہ کیجئے

میں کون تھا کہ عشق نے رسوا کیا مجھے؟ — بے سمجھے نفیِ ہستیِ عنقا نہ کیجئے

کہتا نہیں میں دل کی تمنا نکالئے — لیکن مجھے اسیرِ تمنا نہ کیجئے

رنگِ بہار لالہ و گل ہے فریب کار — ذوقِ نظر کو نذرِ تماشا نہ کیجئے

ضامن! بادم سفر ہو گرانبار جس سے روح
سامان اس طرح کا مہیا نہ کیجئے

(۴)

شرط ہے تابِ نظر چشمِ تماشا کے لئے — پردہ جز حسن نہیں جلوہ پیدا کیلئے

چپ نہ لگ جائے کہیں آتشِ گویا کے لئے — شمع سے لو لگا زباں عرضِ تمنا کیلئے

کام جس سے ہو اسی سے ہے گلوں سے کیا کام — ہم چمن میں بھی گئے تو چمن آرا کیلئے

مجھ سے جب ہو نہ سکی بیخودیِ شوق بیاں — حیرت، آئینہ بنی حسنِ خود آرا کیلئے

قید ہوتی ہیں کہیں جن کی ہے فطرت آزاد! — بیڑیاں موج بناتی رہے دریا کیلئے

حسن ہے اک حجابوں میں کہیں چھپتا ہے — لاکھ منظر ہیں کھلے چشمِ تماشا کیلئے

کچھ غرض اور نہیں نالہ کشی سے ضامن!
مشغلہ چاہیے کوئی دلِ شیدا کے لئے

ضامن کنتوری

یادِ ایّام

مکرم بھائی ۔ اولڈ بوائے کی دو کاپیاں ملیں ممنون ۔ آپکا تقاضہ اور میری سرگذشت قصہ دراز ہے ۔ برسوں گذر گئے ۔ زمانہ ہوگیا ۔

بسکہ ماندم بہ غریبی وطن از یادم رفت　　　بسکہ خاموش نشستم سخن از یادم رفت

اس سے پہلے کہ میرا خیال مصروف کارگراں ہو جائے، اس قصہ کو تمام اپنی تعلیم اور کالج کی زندگی کو ختم کرونگا طوالت مضمون سے اکتا نہ جانا ۔ سچ تو یہ ہے کہ معمولی سی سرگذشت میں بھی ایک نہ ایک سبق آموز نکتہ ہوتا ہے لیکن جس شخص کو مشکلات کا ہمیشہ سامنا رہا ہو، اسکی سرگذشت زیادہ دلچسپ ہوگی ۔ میری سرگذشت دلچسپ نہیں تو کم از کم آپ کے لئے معلومات اور میرے چھوٹے بھائیوں کیلئے سبق آموز ہوگی ۔

مشیّت ایزدی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایک اچھے گھرانے میں پیدا کیا، اور ایک قدیم خاندان اور اسکے بزرگوں کے اچھے کارناموں کی تاریخ کا ایک ورق میرے ہاتھ میں دیا مسلمان پیدا کیا اور مسلمانوں میں افغان پیدا کیا، اور افغانوں میں دُرّانی پیدا کیا، اور دُرانیوں میں ایسے گھر میں پیدا کیا جن کے کارناموں کا ورق تاریخ کا ایک ورق ہے ۔ اچھے معتقد رباب کے گھر پیدا کیا، جو اپنے زمانہ کا چیدہ شخص تھا تعلیم یافتہ، اہل دل، اہل حال مسلمان اور معتقد شخص تھا والدہ بھی تعلیم یافتہ غریب پرور مسکین پرست اور خدا دوست تھیں ۔ میری پیدائش ضلع (پنجاب) کی ہے ۔ میں اپنے پانچ بھائیوں میں سے تیسرا ہوں ۔

اوائل تعلیم مسجد کے مکتب سے شروع ہوئی۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد گلستاں بوستاں اور دوسری کتب درسیہ کے اختتام کے بعد مدرسہ گجرات میں تیسری جماعت میں شامل ہوا۔ ایام طفولیت میں پنجاب کے مختلف شہروں، فاضل کا، فیروزپور، انبالہ، جالندھر، لودھیانہ میں رہا۔ تعلیم انٹرنس کے وقت تک گجرات ہی میں رہا چھوٹی جماعتوں میں گورنمنٹ اسکول میں رہا، اور مڈل کے بعد مشن اسکول میں تعلیم پائی۔ امتحان مڈل میں اپنے ضلع میں اوّل تھا، امتحان انٹرنس میں بھی اپنے ضلع میں اول تھا۔ ریاضی اور سائنس میرے دلچسپ مضامین تھے۔ انٹرنس کی ہر دو جماعتوں میں مسٹر پیٹرسن صاحب کا شاگرد تھا۔ وہ پادری تھے۔ انکی فرشتہ خصلت اور سیرت نے جو اثر میری طبیعت پر کیا اُس نے میری آئندہ زندگی کا راستہ روشن کر دیا۔ انٹرنس کے بعد والد نے مجھے علیگڈھ کالج کو روانہ کر دیا۔ والد مرحوم سردار یار محمد خاں صاحب، سرسیّد کے دوستوں میں سے تھے اگرچہ انکو سرسید کے دینی عقائد سے کچھ اختلاف رہا۔ سرسید سے انکی پہلی ملاقات جالندھر میں ہوئی جہاں وہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔

میں جمعہ واقع ۱۰ ماہ جون ۱۸۹۳ء دن کے (۱) بجے علیگڈھ پہنچا۔ میری جان پہچان کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے لیکن چونکہ میاں احسان الحق صاحب کے والد بزرگوار سے والد مرحوم کے مراسم دوستانہ تھے، اور وہ خود میرے بھی ہمجولی دوست تھے، سیدھا ان کے پاس مشرقی پکی بارک کے بڑے کمرے پر پہنچا، جہاں میاں احسان الحق اور چودھری خوشی محمد صاحب رہا کرتے تھے۔ چودھری خوشی محمد خاں صاحب بھی اہل گجرات اور میرے بزرگوں کے دوست ہونے کے باعث شناسا تھے۔ مجھے نئی جگہ میں آنے اور کالج کی نئی زندگی کے بارے میں چنداں تشویش نہ تھی۔

کالج میں چودھری خوشی محمد خاں صاحب کے علاوہ کافی تعداد پنجابی طلبا کی تھی نیاز احمد صاحب (وکیل سہارنپور) مولوی نذیر احمد (جج کشمیر) دلی داد خاں (وکیل جالندھر) شیخ عبداللہ صاحب (وکیل علیگڈھ) مولوی ظفر علیخاں صاحب (لاہور) سپرنٹنڈنٹ ڈائننگ ہال محمد خانصاحب (وکیل کیمبل پور) اور بہت سے

دیگر طلبا کا اچھا مجمع تھا۔ کمال الدین (بمبئی) بھی تھے۔ قطب الدین (حیدرآباد) بھی تھے، قطب الدین بھی
سید زین الدین، شوکت علی مولانا بھی تھے۔ یہ سب مجھسے اوپر کی جماعت میں تھے۔ سال ۱۸۹۲ء میں اہل پنجاب
کا ایک دریا امنڈ آیا تھا۔ اس سے پہلے پنجاب سے کبھی اتنے طلبا شامل کالج نہ ہوے تھے۔ میرے
خیال میں یہی سال کالج کی ترقی کے آغاز کا تھا۔ محمد عبداللہ مرحوم کرکٹ کپتان (جن کے ماتحت کالج
کرکٹ نے نام اور شہرت حاصل کی) اور ہم دونوں ایک ہی جماعت میں تھے وہ بھی ۱۸۹۲ء میں شامل کالج
ہوے۔ عبدالمجید خانصاحب (کشمیر) بھی میرے ساتھ ہی آئے۔ چونکہ والد بہت عرصہ جالندھر میں
رہے تھے، اسلئے اہل جالندھر سے جان پہچان اور خلوص و محبت بھی زیادہ تھی۔ محمد عبداللہ مرحوم
عبدالمجید خاں۔ شہاب الدین وغیرہ اہل جالندھر میرے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مولوی نذیر احمد صاحب
شیخ عبداللہ صاحب، ظفر علی خاں، ولی داد خاں، نور محمد خاں اور بہت سے دیگر طلبا ہم وطن ہونے کے
باعث اکثر یکجا رہتے تھے۔ شیخ عبداللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوی۔ انکی حالت اور روش سے مجھے
انسے خلوص تھا اور ہم دونوں آپس میں جدا نہ ہونے والے دوست تھے۔

خوشی محمد خاں صاحب دوسرے دن مجھے بک صاحب کے پاس لیگئے۔ میرا لباس اسوقت پنجابی
تھا، یعنے ڈھیلا پاجامہ سر پر پگڑ، اور پنجابی کوٹ۔ بک صاحب مسکرائے، کوٹ کو سامنے سے پکڑ کر خوب
ہلایا اور چند نصائح کے بعد رخصت کیا۔ اسکے بعد محمد خاں صاحب سپرنڈنٹ ڈائننگ ہال سے جو اسوقت
بنگلہ میں رہتے تھے ملا۔ واپسی پر عصر کو چودہری صاحب نے شوکت علی صاحب سے تعارف کرایا۔ مجھے
ہمیشہ اسکی تمنا رہے گی کہ پھر ۱۸۹۲ء کا زمانہ ہو، پھر میں کالج کو داخلہ کے لئے جاؤں، پھر مجھے شوکت علی صاحب
سے انٹروڈیوس کیا جائے، اور پھر دوبارہ میں انکی وہ بچی نظر دیکھوں، اور ہمدردانہ شفقت کے چست
فقرے اور پھبتیاں سُن کر آدمی بن جاؤں۔

شوکت علی صاحب نے فوراً میرا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے چلے! کالج میں سب کمروں میں جاتے،
اور انکو کھلے اور دلچسپ طریقوں پر مجھے ہر جگہ انٹروڈیوس کرتے آگے چلے جاتے، حتیٰ کہ خواجہ کمال الدین صاحب
سے ملاقات ہوئی۔ کمال الدین صاحب (ہائے وہ زمانہ، اب کمال الدین وہ نہ ہونگے، نہ وہ شوخی دل لگی

ہو گئی)، ؔ وہ زندہ دلی) میں ایک خاص مادہ تھا۔ جہاں کہیں نیا طالب علم ان کی نظر پڑا، کہ انھوں نے فوراً ہی تاڑ کر اسکے واسطے نیا نام تجویز کر دیا۔ انکا تجویز کردہ نام ایسا موزوں ہوتا تھا کہ (بقول شوکت صاحب) فوراً چلجاتا تھا، کسی کو بوم، کسی کو بوتل، کسی کو بگوڈا، کسی کو تمباکو، کسی کو بلو بلیک وغیرہ ایسے نام تجویز کرتے کہ فوراً مشہور ہو کر اٹل ہو جاتے تھے۔ کمال الدین صاحب نے مجھے دیکھ کر سیکڑوں پھبتیاں اوڑائیں، سیکڑوں طرح برا بھلا کہا، غرضکہ اچھی طرح دل ٹھنڈا کر کے فرمانے لگے کہ جاؤ تم "پاشا" ہو گئے۔ شوکت صاحب فرمانے لگے کہ چلو تبدیلۂ دل گیا مبارک ہو! آگے چلو۔ یکی بارک، ڈائننگ ہال، سب جگہ انھوں نے چکر لگایا حتیٰ کہ راہ میں کوئی بہشتی یا بھنگی بھی ملجاتا تو اس سے بھی انٹروڈیوس کراتے۔ آخرش ایک لمبے چکر کے بعد مجھے کمرے پر چھوڑ گئے، اور فرمائش کر گئے کہ کرکٹ کے لئے آنا۔ شوکت صاحب اسوقت کرکٹ کپتان تھے، اور سید زین الدین فٹ بال کپتان۔

کالج میں اسوقت اگرچہ جمنیسٹک کے بارس (ستون) وغیرہ بھی یکی بارک کے سامنے بڑے پیپل کے نیچے لگے ہوئے تھے (اب تو وہ دلکش پیپل بھی نہیں ہے) یا کم کم ٹینس ہوتا تھا، کرکٹ اور فٹبال کے سوا دوسرا کوئی کھیل نہ تھا۔ عصر کو حسب الحکم شوکت صاحب میں کرکٹ گروند پر پہنچا۔ وہاں بھائی سرفراز خاں مرحوم، چچا ضیاء اللہ مرحوم، اور منی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ شوکت صاحب نے پہلے ہی دن زور دیا اور کہا کہ کھیل کی پتلون پہنکر آیا کرو۔ میں اسوقت تک کھلاڑی نہ تھا، اور نہ کھلنڈروں میں شامل تھا۔ مجھے کتاب کے سوا کوئی دوسری دلچسپی نہ تھی۔ میری صحت اسقدر کمزور تھی کہ تھوڑا سا چلکر بھی ہانپ جاتا۔ شاید شوکت صاحب نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ کھیلوں میں سب جگہ غیر حاضر تھا لیکن بورڈنگ میں ہمیشہ شوکت صاحب کا رفیق تھا۔ اکثر بورڈنگ میں میں اور محمد عبد اللہ مرحوم شوکت صاحب کے ساتھ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی ایک فوق العادۃ محبت سے میری بہتری کے درپے تھے۔ قدم قدم پر ٹوکتے اور پھبتی کے پیرائے میں نصیحت کر جاتے۔ ایسی نصیحت مجھے یاد بھی رہتی۔ کم کم شہاب الدین صاحب اور دیگر دوستوں کے اسرار پر فٹ بال جانا شروع کیا، اور واقفیت کا دائرہ بڑھنا شروع ہوا۔ اسلام محمد خاں نعمانی مولانا

سے ملاقات ہوئی اور بہت جلد اُنکے خاندان کے دوسرے افراد جمیل احمد صاحب، محمد احمد صاحب، اسلام حامد صاحب اور اسلام احمد صاحب سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا سے مراسم نہایت گہرے برادرانہ تھے، اور محبت ابتک قائم ہے۔ سید عبدالحفیظ صاحب حیدرآبادی سے وہاں ملاقات ہوئی اور رفاقت اسقدر رہی کہ آخر تک ہم دونوں سچے بھائیوں کی طرح ہر میدان میں قدم زن رہے۔ سعید صاحب اور رشید صاحب میرے پٹھان بھائی اسوقت چھوٹے تھے، اگرچہ کرکٹ میں سعید صاحب بہت شوق سے جاتے اور بعد میں کپتان بھی ہوے عظمت اللہ خاں صاحب کپتان (اگرہ وحیدرآباد دکن) شفقت حسین صاحب علی حسن صاحب (کرکٹ کپتان) سجاد حیدر صاحب، ابوالحسن صاحب میرٹھ، محمد حامد صاحب (لارڈ) خواجہ غلام ثقلین صاحب، غلام السبطین صاحب، محمد حیات صاحب (گوالیار) سب سے کم کم ملاقات ہونے پر روابط بڑھتے گئے۔

میرے ہم جماعتوں کے گروہ میں اسلام محمد خاں صاحب، مرحوم مسٹر ممتاز صاحب (لکھنو) محمد اطہر صاحب (فتح پور ہسوہ) عبدالمجید خاں صاحب، ضیاءالحق صاحب (سہارنپور) بھائی جی ظفر علی خاں (حال مالیر کوٹلہ) سید عبداللہ خاں بہادر (مالیر کوٹلہ) علی اکبر حسن علی "بندر" کراچی بندر، محمد امین صاحب فقیہہ (بمبئی) کا مجمع ہر شام وسحر ایک نہ ایک کے کمرے میں رہتا تھا۔ خان بہادر سید عبداللہ صاحب کے بزرگوں سے میرے والد مرحوم کے برادرانہ مراسم تھے۔ ہم ایک ساتھ علیگڈھ گئے، پہلے ایک ہی کمرے میں رہے، اور آخر ش بنگلہ نمبرا میں ایک ایک کمرہ لیکر رہنے لگے۔ محمد امین صاحب فقیہہ میری کالج کی زندگی کے دوسرے سال مجھسے ملے۔ ایک روز عصر کے قریب میں پکی بارک میں ڈائنگ ہال کے پاس کے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ گیٹ کی طرف سے ایک خوشرو جوان، ایرانی چہرہ، خوش سیرت، سرعت سے چلا آرہا ہے اور صندوق سر پر رکھے ایک قلی اس کے نقش قدم پر ساتھ ساتھ ہے۔ مجھسے انھوں نے آتے ہی سوال کیا کہ "شوکت علی صاحب کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا کہ "کوئی خاص کام ہو تو مجھے فرمادیں ورنہ اسوقت تو وہ کمیاب اور لاپتہ ہونگے۔" فرمانے لگے کہ "میرا نام محمد امین ہے، میں بمبئی سے آرہا ہوں۔ کالج میں داخل ہونگا بمبئی سے شوکت علی صاحب کے ایک دوست کا تعارفی خط میرے پاس ہے کہ میرے قیام وغیرہ کا انتظام

کردیں"۔ اسپر میں نے اُنسے کہا کہ قیام کا خیال ہے اور دل ساتھ ہے تو آئیے میرے کمرے میں اور یہاں آرام سے رہئے۔ چند ہی روز میں محمد امین صاحب ہم سے ایسے مل جل گئے کہ اُنکا چھوڑنا ناگوار تھا۔ بعد کے چھ سال میں میں اور وہ پکی بارک سے نکل کر دو سگے بھائیوں کی طرح بنگلہ کے ایک کمرے میں آخر وقت تک رہے۔ محمد امین صاحب کے اچھے سلوک کا ایک بارگراں میری گردن پر ہے۔ اور اسیطرح اور بہتیرے دوستوں کا یہ باری باری سے ادا کرنے کے لئے "اولڈ بوائے" کے صفحات میں آپکو تکلیف دونگا۔

مجھے ڈر ہے کہ داستان لمبی ہوتی جاتی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کردیا تھا کہ میری چوبیس سال کی داستان بہت لمبی ہے۔ آپ نے ہمت دلائی کہ سب ہی بیان کروں لیکن میں اختصار کے ساتھ عرض کررہا ہوں کہ قرضہ جلدی ادا ہو۔ (باقی)

سیلانی

سرسیّد کے چشم و چراغ نواب مسعود جنگ قبل از وقت حیدرآباد کو خداحافظ کہنے والے' اور اپنے بہت سے برادران وطن سے جدا ہونیوالے ہیں۔ مدت ملازمت تو اکتوبر ۲۶ء میں ختم ہوگی، مگر ہمارے بھائی کی خواہش پر حضور پرنور نے آئندہ جولائی سے ہی بعطائے وظیفہ عزیمت سفر یورپ کی اجازت مرحمت فرمادی ہے۔ اس سفر کی بڑی غرض یہ ہے کہ مسعود جنگ اپنے دونوں بچوں کی آئندہ تعلیم کا انتظام کرسکیں۔ مسعود جنگ بہادر کی ذات سے جو فوائد سررشتۂ تعلیمات کو پہنچے ہیں، انکی تفصیل تو سررشتہ مذکور کی رپورٹوں میں موجود ہے لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ حیدرآباد کی سوسائٹی کی رونق ایک بڑی حد تک ان کی ذات سے ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کی بولتی ہوی تپلی ہیں۔ بسترہ پاس مسعود کی صحبت میں کوئی دل کا مارا پہنچ جائے، تو اُن کے کمرے سے نکلتے نکلتے سارا مرض کافور ہوا اور اسے مسز سروجنی نائڈو کے میاں ڈاکٹر نائڈو کے پاس علاج کی غرض سے جانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب سنتے ہیں کہ نواب مسعود جنگ بہادر ہماری یونیورسٹی کے انتظام کی ذمہ داری اپنے سر لینے والے ہیں! ایسا ہوگیا تو طلبہ میں زندہ دلی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔

ہمارا کالج

گزشتہ اولڈ بوائز ڈنر کے حالات تو ہم نے نومبر نمبر ہی میں درج کر دیے تھے، اور جناب سکرٹری صاحب کی رپورٹ کو اپنے دسمبر نمبر کا سرنامہ بنایا تھا۔ میٹنگ کے ضروری رزولیوشن رہ گئے تھے، وہ بھی گزشتہ نمبر ہی میں درج ہو جاتے۔ مگر اللہ کو ایسا ہی منظور تھا کہ یہ باسی کڑھی بن کر ہمارے بھائیوں کی میز تک پہنچیں۔ ان رزولیوشنوں میں سے پہلا "وقف تعلیم اولاد" پر تھا اور دوسرا "اولڈ بوائز لاج" کے مکمل قبضہ پر، ان دونوں رزولیوشنوں کی تحریک و تائید پروفیسر خلیل احمد مراد صاحب اور خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی صاحب نے فرمائی تھی۔ آخری رزولیوشن "مسلم خواتین میں عربی و انگریزی تعلیم کی توسیع" پر تھا، اور یہ خود ہمارے سکرٹری صاحب نے پیش فرمایا تھا۔ پہلے رزولیوشن کے باب میں یہ عرض کرنا خلاف موقع نہ ہوگا کہ اولاد کی تعلیم لڑکا ہو یا لڑکی، ہمارے اوپر یکساں فرض ہے، اور بقدر طاقت ہم کو اس سے باز نہ آنا چاہیے۔ لیکن یہ امر کہاں تک قرین صواب ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے روپیہ اپنی لڑکیوں کے وقت، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دماغ کو تعلیم کے موجودہ غیر ضروری نظام کے اتباع میں صرف کر دیں۔ یہ باتیں سوچنے، سمجھنے، اور پھر عمل کرنے کی ہیں۔ زنانہ تعلیم سے متعلق ہمارا اپنا نظام ہونا چاہیے۔ "اولڈ بوائز لاج" کے مکمل قبضہ سے متعلق ہمارا ایک مختصر سا وفد جس میں مسٹر محمد یعقوب، مسٹر ظفر عسکر، مسٹر عبدالعزیز، اور مسٹر نیاز محمد خاں شریک تھے، نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ان بھائیوں کی سعی مشکور ہوئی، اور نواب صاحب معظم کی توجہ سے "لاج" اب ہمارا ہو چکا ہے۔ آخری مگر ضروری تحریک پر قال و قیل تو بہت ہوئی، مگر نتیجہ ہیچ۔ سوال یہ تھا کہ ایک معقول وظیفہ پر ہماری لڑکیوں میں سے ایک کو دو سال کے لئے

مصر روانہ کیا جایا کرے، تاکہ تعلیم وتربیت سے بہرہ اندوز ہونے کے سوا ایک اسلامی ملک کی معاشرت کا بھی انھیں ذاتی تجربہ ہوتا رہے۔ اسپر ایک جانب مسٹر اختر عادل، سید حامد حسین خان بہادر، اور مسٹر اے۔ ایم قریشی کے درمیان "پردہ" کا سوال زیر بحث رہا، اور دوسری طرف خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی، اور مسٹر عزیز پوری میں "مردانہ وزنانہ تعلیم" کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اور اصل رزولیوشن "ہمالسنت کہ بود" پر ختم ہوگیا۔ ہمیں امید ہے کہ سال آئندہ یہ تحریک مکرر پیش کی جائے گی۔ اس موقعہ پر سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء کا موازنہ (بجٹ) بھی شام کے اجلاس میں پیش ہو کر منظور فرمایا گیا۔

ایک زمانہ میں کالج اور اسکول دو ہی ہمارے تعلیمی ادارے تھے۔ اب یونیورسٹی اور اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ مگر ان میں قدیم زندہ دلی کہاں تک موجود ہے ہمیں اس کا تجربہ نہیں۔ طلبہ کی اتنی بڑی آبادی سے ہمارے کانوں تک عزیزی مسٹر سید علی جعفری (متعلم سینیر بی۔اے) کے لہجہ میں یہ صدا آئی ہے کہ "خط ملا، دونوں رسالے وصول ہوے۔ لکھائی چھپائی کے علاوہ مضامین بھی نہایت معقول وپسندیدہ تھے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپکا یہ پرچہ مقبول ہو اور تمام ہندوستان کے اولڈبوائز میں اسکی ہمیشہ مانگ رہے" مسٹر سید علی، حکیم کے فرزند ہیں، اسلئے ہمیں امید ہے کہ وہ دعا کی بجائے دوا بھیجیں گے۔ یہ دوا ہمارے ریڈنگ روموں اور ایسوسی ایشنوں میں بکتی ہے جہاں پہلے اولڈبوائے کی ہر جگہ مانگ تھی۔

اولڈ بوائز

۱۔ برادرم قاضی امیر الدین احمد صاحب دیوان ریاست بجاور کی نظر سے "اولڈ بوائے" کے ابتدائی دو نمبر گذرے، تو انھوں نے دستِ محبت ہماری جانب بڑھایا، اور ڈائرکٹری کے لئے بھی چند سطریں لکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائی۔ ہم بہت بہت ممنون ہوتے اگر قاضی صاحب ہمارے اس سوال کو بھی حل فرما دیتے جو تفریحی مشاغل سے متعلق درج رسالہ ہے۔ اسیطرح فرزند کا نام بھی ہمیں مطلوب ہے (اگرچہ خُرد سال ہی کیوں نہو) خط مورخہ ۲۸ر دسمبر ۲۷ء درج ذیل ہے۔

"آپ کے ۲۲ ماہ حال کے یاد نامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی عنایت تھی کہ مجھ کو یاد رکھا اور اپنے رسالہ میں میرے تقرر کا ذکر کیا۔ ذریعہ منی آرڈر مبلغ ۔۔۔۔۔۔ اولڈ بوائز کے اس رسالہ کے سال تمام کے چندہ کے روانہ کئے جاتے ہیں۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ آپکو الما میٹر سے اسقدر دلچسپی ہے۔ "ڈائرکٹری" جس کی اشاعت کی تیاری علیگڈھیوں کے فائدہ کے مدنظر آپ کر رہے ہیں میں اسمیں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں"۔

۱۔ قاضی امیر الدین احمد فرزند خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب سی۔ آئی۔ ای او بی۔ ای۔ آئی۔ ایس۔ او رئیس قصبہ بسوان ضلع سیتاپور (اودھ) ۲۸ر جنوری ۱۸۹۶ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوا۔

۲۔ علیگڈھ میں مسٹر ایف کوپر کے ساتھ رہکر ۱۹۰۱ء میں تعلیم کی ابتدا کی اور ۱۹۰۲ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں شرکت کرکے ۱۹۱۲ء تک وہاں رہا۔ اسکے بعد ۱۹۱۷ء میں آگرہ کالج سے بی۔ اے پاس کیا (اور سال مذکور ہی میں) ملازمت مل گئی۔

۳ - ۱۹۱۶ء میں شادی ہوئی۔ اب ایک لڑکا اور ایک لڑکی موجود ہے۔

۲ - ہمارے مخدوم و مکرم اور ہمارے کالج کی انتظامی جماعت کے سابق اسٹنٹ سکریٹری مولوی ابوالحسن صاحب صدر مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) قسمت گورکھپور ارقام فرماتے ہیں:

"سال نو آپ کو اور آپکے رسالہ کو مبارک ہو۔ آمین! میں خوشی سے رسالہ "اولڈبوائے" کی خریداری منظور کرتا ہوں۔ مہربانی فرماکر اگلا پرچہ سال بھر کے چندہ کیلئے ویلیو پی ایبل روانہ فرمائیے بہتر ہوگا کہ پرچہ میرے لڑکے حسن عبداللہ بی۔اے کے نام سے جاری فرمایا جائے، جو خود بھی اولڈبوائے ہے۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

مولوی صاحب کی توجہ ہمارے لئے قابل شکرگزاری اور "اولڈبوائے" کے میدان کو وسیع تر کرنے کے لئے دوسرے بھائیوں کی توجہ کے لائق ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ایک نام کے دو خریدار ہمارے رجسٹر پر آگئے! ایک تو ہمارے حیدرآباد ہی میں مسٹر عبداللہ حسن، اور دوسرے مسٹر حسن عبداللہ۔

۳ - برادر عزیز کپتان نظیر الاسلام صاحب اپنے محبت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

گرامی نامہ کا شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کا وی پی غالباً میرے غیاب میں آئیگا، کیونکہ میں کل صبح پندرہ روز کیواسطے کیمپ کو جارہا ہوں۔ اسکے وصول کرلینے کیلئے گھر کے لوگوں سے کہدیا ہے۔ .... فوجی اولڈبوائز کی فہرست واپسی پر روانہ خدمت کروں گا۔"

ہم اپنے برادر عزیز کی توجہ فرمائی کے شکرگزار ہیں۔ نظیر بیگم کی عنایت سے رقم ہمیں وصول ہوگئی۔ فوجی اولڈبوائز کی فہرست تیار کرتے وقت وہ اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ ہماری برادری میں سے نواب نذیر جنگ بہادر و نواب صمد یار جنگ بہادر سابق و حال معتمد (سکریٹری) فوج سرکار آصفیہ کے سوا، کرنل مرزا قادر بیگ، کرنل عظمت اللہ، میجر عبدالجبار، میجر مرزا جیلانی بیگ، میجر عبدالصمد، میجر ریاست علی مرزا، کپتان محمود حسین خاں، کپتان میاں محمد بشیر، لفٹنٹ سید محمد حسین، لفٹنٹ امیر احمد، اور سب لفٹنٹ قیصر مرزا بیگ "اولڈبوائے" کی قدر افزائی قبل ازقبل فرماچکے ہیں۔ معتمدی فوج میں بھی ہمارے بھائی مسٹر معزالدین بی۔اے "اولڈبوائے" کو خرید چکے ہیں۔ فوج باقاعدہ کے غیر اولڈبوائے حضرات میں سے صرف کپتان محمد اعجاز علی صاحب شہرت

اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ فوج بےقاعدہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری برادری زیادہ نہیں ہے۔ اس جماعت سے برادرم کیپٹن مرزا محسن بیگ اولڈبوائے کے قدرداں ہیں اور غیراولڈبوائز میں بھی جمعدار ولی داد خان صاحب کے سوا میدان صاف ہے۔ صیغہ طبابت فوج میں سے کیپٹن اشرف الحق اولڈبوائے کے قدرداں ہیں۔

۴ ہماری بھائیوں میں سے مسٹر محمد حنیف تحصیلدار اور مسٹر سید محمد موسٰے کاظم تحصیلدار کے تبادلوں کی اطلاع ہمارے پاس آئی ہے۔ اوّل الذکر تحصیل پرولسے حضور تحصیل اناؤ میں تشریف لے آئے ہیں اور آخرالذکر تحصیل مجھلی شہر سے تحصیل (بڈھانا) ضلع مظفرنگر کو تشریف لیگئے ہیں۔ کیا ہمارے یہ دونوں بھائی دوسرے بہت سے بھائیوں کیطرح ڈائرکٹری کیلئے اپنے حالات روانہ فرمادیں گے؟

۵۔ ریاست بہاولپور میں انتظامی جماعت نے حکومت پنجاب سے برادرعزیز مسٹر میاں محمد خاں بی۔ایس۔ اسی (گلاسگو) ایگزیکیٹو انجینئر کے خدمات حاصل فرماکر اپنے سررشتۂ آبپاشی میں ایک مفید اضافہ فرمایا ہے۔ ہماری بھائی کو عباسیہ ڈویژن کی آبپاشی کا کام سپرد ہوا ہے جہاں بہت سے جدید کاموں کا آغاز ہوا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ریاست بھاولپور کی آبپاشی کی تاریخ کے ساتھ ہماری ایک بھائی کا نام ابدالآباد تک شریک رہیگا۔

۶۔ نواب عمادالملک مرحوم کا نام ہمارے بہت سے کاموںکے ساتھ یادگار رہیگا۔ اس "ہمارے" سے مُراد ہمارے قومی اور ذاتی دونوں کاموںسے ہے۔ مرحوم کے دو بڑے فرزند نواب عابد نواز جنگ بہادر اور مولوی سید ہاشم صاحب بلگرامی مرحوم قرون اولیٰ میں ہماری برادری میں شرکت کی عزت حاصل کرچکے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے فرزند اصغر نواب مہدی یار جنگ بہادر کی تعلیم وتعلم سے متعلق ہمارے معلومات بالکل محدود ہیں۔ البتہ ان سے بڑے بھائی نواب عقیل جنگ بہادر کے باب میں ہم یقین کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انکی تعلیم حیدرآباد (دارنظام کالج) سے باہر کبھی نہیں ہوئی اور زیادہ تر اپنے والد ماجد کے آغوش شفقت میں تربیت حاصل فرماتے رہے۔ انکی بڑی صاحبزادی کی شادی مدت ہوئی مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت سے ہوئی تھی اور اب ۱۳ رجب المرجب سال رواں کو انکی دوسری صاحبزادی کی شادی کے مراسم کی تکمیل ہماری برادری کے ایک فرد مسٹر سید محمد جواد بی۔اے۔بی۔ٹی مہتمم تعلیمات ضلع محبوب نگر سے ہوئی ہے۔ مراسم سے

ہمارے دور افتادہ بھائی یہ خیال نہ کریں کہ اس شادی میں بھی اُن غیر ضروری رسموں کو برقرار رکھا گیا تھا جو اب سے پہلے ہمارے ملک کے گوشہ گوشہ میں جاری تھے۔ ان فضولیات سے تو نواب عقیل جنگ بہادر بہت دور ہیں۔ عقد، ضروری جہیز، ولیمہ کا "اٹ ہوم" اور بس! "اٹ ہوم" میں حیدرآباد کے طبقۂ اعلیٰ سے لیکر ہر طبقہ و درجہ کے ضروری احباب شریک تھے۔ ہم ایک جانب نواب صاحب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے پر ہدیہ مبارکباد بھیجتے ہیں اور دوسری طرف اپنے بھائی مسٹر سید محمد جواد کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ ہاں! اس موقعہ پر ہم محل مولوی سید امیر حسن صاحب کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، جن کے دستِ شفقت نے دلہن کی زندگی کے سنوارنے میں ایک مدت تک کام کیا ہے۔

۷۔ برادر عزیز مسٹر منصور عالم بدایونی "اولڈبوائے" کو انگلستان کے پتہ پر جاری کرنے کی فرمایش کر کے تحریر فرماتے ہیں۔

> میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک کالج میں رہا۔ بی۔ اے میں ناکام ہو کر تعلیم ختم کر دی۔ ۱۹۲۳ء کانپور میں تجارتی اور صنعتی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں اس فرم (یعنی ایشیاٹک لیدر کمپنی) کی ابتدا کی۔ اب گورنمنٹ کیطرف سے (Leather works) کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ جا رہا ہوں۔"

ہمارے بھائی نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ برادران کانپور کی فہرست اور جملہ حالات سید احمد حسن صاحب تاجر چرم طلاق محل کانپور سے طلب کئے جائیں۔ ہم اپنے برادر عزیز کو خدا حافظ کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انکا یہ سفر کامیاب ہو۔

۸۔ ہمیں معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی، اور یقیناً ہماری برادری کے بہت سے احباب اس اطلاع سے مسرور ہونگے کہ مسٹر محمد عثمان وائس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کو اب ترقی کیساتھ یوروپین گریڈ میں لے لیا گیا ہے۔ ہمارے ناظرین حیرت فرمائیں گے کہ ایک نیٹو گوروں میں کیسے ملگیا، مگر یہاں نگین چہرہ کا نہیں، بلکہ اچھے دل و دماغ کا سوال ہے۔ مسٹر عثمان اپنے فٹ بال کی بدولت نہیں، بلکہ اور بہت سے کھیلوں کے باعث اپنے زمانہ میں بھول دھوم رہے، اور کھیلتے کودتے بی۔ اے بھی علیگڈھ ہی سے کرلیا۔ ولایت کی سند کی شرط تھی، وہ بھی تعلیمات کی ملازمت کے زمانہ میں لے آئے۔ ترقی کی خوشی میں احباب کی دعوت اور سہمنی نیاز کی تھی، جس میں احباب کے دل آئے، اور کھاپی کر چل دیئے۔ ایسی نیاز خدا کرے ہمارے بھائی بار بار کرتے رہیں۔

۹۔ برادرِ مکرم مسٹر مرزا محمد بہادر کے فرزند مسٹر یوسف مرزا (جو خود بھی ہماری کالج کے فرزند ہیں) انگلستان کی تعلیم سے فارغ ہوکر اور میکینکل انجنیری کی اعلیٰ سند لیکر وطن واپس آگئے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی دارالضرب سرکار آصفیہ کے تعلیمی ادارہ میں کام بھی شروع کردیا ہے۔ "اولڈبوائے" کے دورِ اوّل میں اپنے تازہ مسافر کے والد ماجد کی خاطر ہمیں کبھی کبھی مارسین کورٹ جاکر انکی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ مسٹر یوسف کو ولایت کی ہوا کھانیکے بعد بھی وہ زمانہ یاد ہے، اور اب ہماری اس فرض شناسی کا معاوضہ کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے ہمارے بچوں میں سے سید علی اصغر کو اپنے ڈھب کا پاکر اُسے لہار بنانے کی فکر کی ہے، اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ نوخیز برادران کالج کی معلومات کی خاطر وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو "اولڈبوائے" کیلئے قلمبند کردیں گے۔ ہم مرزا محمد بہادر صاحب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ناظرینِ رسالہ اطمینان رکھیں کہ یہ بھائی ان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

۱۰۔ غرہ ماہ رجب اعلیٰحضرت حضور نظام کا یوم سالگرہ ہے اور اس پورے مہینہ میں متوسلین دولت خوشیاں منایا کرتے ہیں۔ اس خوشی میں عمائد ملک اعزاز و خطابات سے سرفرازی عطا فرمائی جاتی ہے۔ اس مرتبہ بارگاہ خسروی سے آغا محمد علی خاں صاحب، مرزا بشیر بیگ صاحب، مولوی معشوق حسین خاں صاحب، اور سید نثار احمد صاحب کو یہ عزت نصیب ہوئی، اور یہ حضرات "یار جنگ" کے خطاب کے مستحق قرار پائے۔ آخرالذکر تین صاحبان ہماری کالج کے فرزند ہیں۔ ہم ان سب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ ادبی ذوق رکھنے والے بھائی کہتے ہیں کہ مولوی معشوق حسین خانصاحب کے نام پر خطاب خوب چپکا! کہ "معشوق" کو "جنگ" کے ساتھ "یار" مل گیا۔ تلنگے بھائیوں کو اچار کھانے کی عادت ہے، اور اس خوشی کے موقعہ پر املی کے اچار کا تقاضہ کرکے ہمارا ناطقہ تنگ کر رہے ہیں۔ شائد انھیں اس کی خبر نہیں کہ برادرِ مکرم مولوی عبدالحق صاحب نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور کہتے ہیں کہ اس خطاب کے اعزاز میں "ہاشمی منزل" پر ایک مختصر سی دعوت کا اعلان فرمادیا۔ دعوت میں ایک آدھ صدرالمہام دو ایک معتمد اور تین چار ناظم صاحباں کے سوا ضرورت کے تقریباً تمام احباب شریک تھے۔ خود مولوی صاحب کو بھی تین سو روپیہ ماہانہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے اور سنتے ہیں کہ اس خوشی میں صرف ڈاکٹر...... یار جنگ بہادر کو مستثنیٰ کرکے دعوت میں شریک کیا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہی ایک محفل سے کیا کم ہیں!

۱۱۔ یہ نمبر اولڈبوائے روانہ کرتے ہوئے برادر مکرم مولوی مصطفےٰ خانصاحب بی۔ ای۔ بی۔ ٹی مہتمم تعلیمات

ضلع عادل آباد کو اولڈ بوائز ڈاکٹری کی جانب توجہہ دلائی تھی۔ ہماری ساری داستان کا پرلطف جواب ایک شعر میں دیتے ہیں۔ آپ بھی سُن لیں ؎

کیا کہیں ہم تم سے کیا کارنمایاں کر گئے　　　بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

۱۲۔ عزیزی مسٹر ارشاد الحق (جنگاؤں) اسکی دعا کرتے ہیں کہ رسالہ کی عمر حبیب عیدروس صاحب سے بھی زیادہ ہو اور اسکی اشاعت دکن کے شریفوں (سیتاپھلوں) کیطرح کثیر ہو جائے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے شریفوں نے اس جانب توجہہ فرمائی تو اشاعت میں ترقی ہوگی اور عمر بھی بڑہجائے گی۔

۱۳۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوی کہ برادرم مسٹر ناظر حسن انصاری کی سعی سے گوالیار میں اسپورٹس کو بڑی ترقی ہوی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مسٹر انصاری میں علیگڈھ کی روح اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کا ظہور گزشتہ ہمی ٹورنمنٹ کے موقعہ پر گوالیار میں ہوا تھا، جبکہ ہز ہائنس مہاراجہ بہادر، اور پرنس کے سوا، آنریبل مسٹر کرمپ (ورزیڈنٹ) اور دوسرے عمائد موجود تھے۔ صاحب عالیشان گوالیار اسپورٹس اسیوسی ایشن کے پریسیڈنٹ، اور ہمارے بھائی اسکے سکرٹری ہیں۔

۱۴۔ گزشتہ قومی ہفتہ میں بہت سی انجمنوں کے اجلاس مدراس میں ہوے تھے، ان کے منجملہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" اور "آل انڈیا خلافت کانفرنس" کو کامیاب بنانے میں ہمارے بھائیوں میں سے مسٹر اے حمید حسن اور مسٹر یعقوب حسن نے بڑی کوشش فرمائی۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسٹر اے حمید حسن پورے ۱۹۲۵ء میں توجہہ کیساتھ اپنے فرائض قومی کو انجام دیتے رہے ہیں اور یہ تو ایک مدت کی بات ہے کہ سیٹھ یعقوب حسن سرتاپا "قوم" بن چکے تھے۔ "آل انڈیا تبلیغ کانفرنس" کے اجلاس زیر صدارت حاجی لارڈ ہیڈلی دہلی میں ہوے۔ انکی کامیابی کا سہرا برادر محترم مولوی غلام بھیک صاحب نیرنگ کے سر ہے۔

۱۵۔ ہمیں اڑتی سی خبر ملی ہے کہ گزشتہ ماہ کے ختم ہوتے ہوتے ہمارے بھائیوں میں سے دو گھر ملو زندگی میں داخل ہو گئے یہ اتفاق ہے کہ دونوں اولڈ بوائز کے فرزند اور خود اولڈ بوائے ہیں۔ مسٹر خورشید احمد (فرزند صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) کی شادی سنتے ہیں کہ بریلی میں ہوئی ہے۔ دوسری شادی سے متعلق مسٹر اعجاز احمد (فرزند خانصاحب امتیاز محمد خاں) کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ تقریب بھی اسی زمانہ میں مسٹر ممنون حسن خاں (اولڈ بوائے) ظلیعفیاب

ڈپٹی کلکٹر کی دختر سے قرار پائی تھی، اور بفضلہ خیرت کے ساتھ انجام کو پہنچی۔

اسی سلسلہ میں ایک تیسری شادی پر بھی خوشیاں منائی گئیں۔ یہ شادی ہمارے برادر مکرم میجر سید محمد خاں کی بھتیجی اور برادر عزیز مسٹر رشید محمد خاں کی دختر کی ہے۔ شادی خورجہ میں رچائی گئی تھی، اور سنا ہے کہ قدیم رسم کے مطابق مایوں کے ایک اللہ مارے تو بہ! ایک کبشیر نے موقعہ کے مناسب حال ایک گیت سے اہل محفل کو محظوظ کیا، جو یہ ہے:

رشید میاں کی لڑکی رشید میاں کو بیاہی   رشید میاں سسری رشید میاں جنوائی

مزہ اس میں ہے کہ نوشاہ کا نام عبدالرشید خاں ہے۔ دلھن کے باوا اور چچا دونوں ہماری مبارکباد قبول کریں۔

۱۶۔ دسمبر کے عشرہ ثانی میں اعلیحضرت شاہ افغانستان کے تشریف فرمائے ہند ہونے کے موقع پر چمن، کوئیٹہ، کراچی، اور بمبئی میں جس شادمانی کا اظہار عامہ خلایق نے کیا اسکی نظیر ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک مدت سے نہیں ملتی۔ بمبئی میں کافتہ الناس کیجانب سے شاہ امان اللہ کی پذیرائی، ایک مدت تک یادگار رہے گی۔ اس پذیرائی کا انتظام خلافت کمیٹی اور مسلمانان بمبئی کیجانب سے ہمارے برادر اکبر مولانا شوکت علیصاحب اور انکے فدائیوں نے کیا تھا۔

۱۷۔ ناظرین اولڈبوائز کو یہ معلوم کر کے قلق ہوگا کہ برادر عزیز مسٹر صدیق حسن ایم اے پروفیسر سٹی کالج نے یکایک رحلت کی۔ مرحوم تعطیلات سرما بسر کرنیکی غرض سے عازم وطن ہوے تھے، مگر وہاں پہنچے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ کپٹن نظیرالاسلام کو خدا جزائے خیر دے کہ ایک غریب الوطن بھائی کی آخری راحت گاہ اپنے اعزہ کی قبرستان میں قرار دی۔

۱۸۔ نہایت رنج و افسوس کیساتھ ہم نے اس خبر کو سنا کہ ہمارے بھائی مولوی ولایت علی صاحب بی اے صدر مدرس مدرسہ شاہ علی بنڈہ واڈیٹر حیدرآباد ٹیچر نے تقریباً چودہ روز کی علالت کے بعد، ۱۰ رجب کی شام کو دواخانہ عثمانیہ میں بعارضہ نمونیا انتقال فرمایا۔ اس غم میں ہم مرحوم کے پسماندوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ خداوند عالم برادر عزیز مولوی خیرات علیصاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جنوری کے آخر عشرہ میں، باغ عامہ کی شرطیں معززین حیدرآباد و سکندرآباد کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ پہلے سنگل فائنل Final ۔ میں دو بھائیوں مسٹر سید محمد ہادی (علیگڈھ) اور مسٹر سید محمد جواد کے نام آئے، اور اول الذکر نے آسانی کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی پر فتح حاصل کرلی۔ تین سیٹ کھیلے گئے۔ ان کے منجملہ